رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار

قیمت فی کاپی ۸ر

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر پرچہ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸؍ کے ٹکٹ موصول ہونے پر۔

مینجر "نگار"

تصانیف نیاز فتحپوری

نگار خانہ جینی — نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل ہوچکے ہیں۔ قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان، اس کی تخیل، اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۲ افسانے ۳۳ء تک کے درج ہیں — قدرت بیان اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری سبایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت چار روپیہ (للعہ)

علاوہ محصول

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں معہ تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ)

علاوہ محصول

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ۔ ششماہی تین روپیہ

ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر بہ وجۂ اضافۂ ضخامت وقیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۳۹	فہرست مضامین جون سنہ ۱۹۴۱ء	شمار ۶

ملاحظات ---------- ۲

شاد عارفی کی غزل گوئی ---------- محب عارفی ---------- ۶

تاریخ اودھ کا ایک ورق ---------- مشیر احمد علوی ---------- ۹

وقت کا اہم ترین مسئلہ ---------- محمد عتیق صدیقی ---------- ۱۸

پاسِ عہد (ایک تاریخی رومان) ---------- ۲۲

مٹی سے سونا ---------- ۲۹

گورکن (نفسیاتی افسانہ) ---------- احتشام حسین رضوی ---------- ۳۲

اُردو زبان کا ایک اور رسم الخط ---------- عبدالواحد خاں واحدؔ ---------- ۳۶

مکتوبات نیاز ---------- ۴۰

مذہب اور قناعت ---------- علی امام ---------- ۴۳

بقیہ صفحہ ۸ ---------- ۴۹

باب الاستفسار ---------- ۵۴

باب المراسلۃ والمناظرہ ---------- ۵۵

معلومات ---------- ۵۶

مطبوعات موصولہ ---------- ۵۸

منظومات ---------- رزمی۔ عدمؔ۔ تہرؔ۔ گوہرؔ ---------- ۵۹

دماغی تفریح ---------- ۶۲

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۳۹	جون سنہ ۴۱ء	شمار ۶

ملاحظات

آیندہ جنوری سنہ ۴۲ء کا نگار ہر چند کاغذ کی کمیابی، اسباب طباعت کی گرانی اور پبلک کی طرف سے ہمت افزائی کا فقدان — یہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ ہم آیندہ جنوری کا نگار حسب معمول سالنامہ کی حیثیت سے شایع کریں، لیکن چونکہ بات "سخن گسترانہ" ہے اور سوال خود اپنی "وضع" کا ہے، اس لئے باوجود ان تمام موانع کے جنوری سنہ ۴۲ء کا پرچہ نہ صرف اسی ضخامت و اہتمام کے ساتھ شایع ہوگا جو نگار کے سالناموں کی خصوصیت رہی ہے بلکہ اسوقت تک کے تمام سالناموں سے زیادہ اہم اور زیادہ مفید و دلچسپ حیثیت سے شایع ہوگا

گزشتہ جنوری کی اشاعت میں آپ دور حاضر کے ۳۱ اکابر شعراء کے کلام کا انتخاب ملاحظہ فرما چکے ہیں، لیکن تکمیل کا اقتضاء یہ تھا کہ تمام کلام پر نقد و تبصرہ بھی شایع کیا جاتا۔ اول اول تو ارادہ یہی تھا کہ تنہا میں اس خدمت کو انجام دوں لیکن بعد کو ایک صورت اس سے بہتر ذہن میں آئی اور وہ یہ کہ کیوں نہ ملک کے بہترین نقادوں کو نقد و تبصرہ کی دعوت دیجائے اور یہ تمام مقالے یکجا شایع کر دئے جائیں — چنانچہ میں نے ہندوستان کے مختلف صوبوں سے ایک ایک نقاد کا انتخاب کر کے مفصل تبصرہ کی دعوت دی ہو اور قارئین نگار یہ سُنکر غالباً بہت خوش ہوں گے کہ ان حضرات نے میری درخواست کو قبول فرمالیا ہے

جنوری سنہ ۴۲ء کا نگار انھیں تمام انتقادی مقالات کا مجموعہ ہوگا، اس لئے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہر ہر شاعر کے متعلق متعدد نقادوں کی رائے معلوم کرنا کسقدر مفید و دلچسپ بات ہوگی۔ اخیر میں ایک انتقادی مقالہ میرا بھی ہوگا جس میں تمام نقادوں کی رائے کو سامنے رکھ کر اظہار خیال کیا جائے گا

اس طرح اگر جنوری سنہ ۴۱ء کا نگار شاعروں کے لئے وقف تھا تو جنوری سنہ ۴۲ء کا نگار نقادوں کے لئے وقف ہوگا۔ یعنی خود شعراء کرام نے جو خط و خال اپنے پیش کئے تھے اُن کے حُسن و قبح کا فیصلہ فنی حیثیت سے کیا جائے گا۔

اس سے زیادہ جنوری سنہ ۴۲ء کے نگار کے متعلق کہنے کی ضرورت نہیں، ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ فنِ نقد کے لحاظ سے

یہ مجموعہ کتنی بیش قیمت چیز ہوگا

اس سلسلہ میں ایک بات مجھے اور کہنا ہے، وہ یہ کہ علاوہ اُن حضرات کے جن کو میں نے تبصرہ کی دعوت دی ہے، دوسرے اہلِ نظر بھی تبصرہ فرما سکتے ہیں، لیکن اُن کے مقالے جنوری ۱۹۴۲ء کی اشاعت میں شامل نہ ہوں گے، بلکہ اس سے پہلے یا بعد کو شایع ہوسکیں گے

آیندہ اگست ۱۹۴۱ء کا نگار

اس سال کا خاص پرچہ ہوگا، یعنی وہ صرف جنگ، و حالات جنگ کے لئے مخصوص ہوگا۔ اس اشاعت میں لڑائی کے حال و مستقبل پر روشنی ڈالی جائے گی اور ساتھ ہی ساتھ نقشوں اور چارٹوں کے ذریعہ سے تمام ملکوں کی موجودہ عسکری و سیاسی پوزیشن کو بھی واضح کیا جائے گا۔ اگر کوئی صاحب جنگ سے متعلق کسی موضوع پر کوئی مقالہ مرحمت فرمائیں گے تو شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا

رفتارِ جنگ

پچھلے مہینے ہم نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یوگوسلیویا اور یونان کے بعد اس بات کا قوی امکان ہے کہ لڑائی کا رُخ عراق و ایران کی طرف ہوجائے اور روسی حکومت پر دباؤ ڈال کر نازی جماعت شام میں اپنے قدم جمالے، چنانچہ یہ خیال پورا ہوکر رہا

عراق میں نازی پروپاگنڈا عرصہ سے کام کر رہا تھا اور جسوقت وہاں کے ریجنٹ کو نکال کر رشید عالی نے عنانِ سیادت اپنے ہاتھ میں لی، اسی وقت معلوم ہوگیا تھا کہ عراق کی فضا کافی مکدر ہوچکی ہے، لیکن یہ گمان نہ تھا کہ رشید عالی اس قدر جلد برطانوی فوجوں پر حملہ بھی کردے گا

ظاہر ہے کہ اس نے یہ سب کچھ صرف اس امید پر کیا تھا کہ نازی حکومت اس کی مدد کرے گی اور اس کی یہ توقع غلط بھی نہ تھی لیکن اس نے وقت سے بہت پہلے پیشقدمی شروع کردی۔ نازی حکومت یہ ضرور چاہتی تھی کہ عراق میں بدامنی پیدا ہوجائے، لیکن برطانوی افواج پر حملہ کرنے کا وقت ابھی نہ آیا تھا اور راشد عالی کی جلدی نے ہٹلر کی سب سکیم کو پورا نہ ہونے دیا

رشید عالی کو سوچنا چاہئے تھا کہ عراق میں نازی امداد کے دو ہی راستے ہوسکتے ہیں، ایک ترکی دوسرا شام۔ ظاہر ہے کہ ترکی کا راستہ اختیار نہ کیا جاسکتا تھا اور شام کی طرف سے نازی امداد حاصل ہونے کے لئے پہلے فلسطین کی بندرگاہوں اور کریٹ و قبرص کی طرف سے مطمئن ہوجانا ضروری تھا

رشید عالی کے اقدام کے بعد ہر چند ہٹلر نے وشی حکومت پر دباؤ ڈال کر شام میں اپنے قدم تو جمالئے اور کچھ سامان جنگ بھی حلب کے راستہ سے عراق تک پہونچایا گیا، لیکن یہ کوئی زیادہ اہم بات نہ تھی، کیونکہ اصل لڑائی تو اسسے پہلے کریٹ اور پھر اس کے بعد قبرص میں لڑنا تھی۔ اسی لئے عراق کا فتنہ زیادہ کامیاب نہ ہوسکا اور رشید عالی کو پھر سابق ریجنٹ کے لئے جگہ چھوڑنا پڑی

کریٹ کا رنگ البتہ خراب ہے اور عجب نہیں کہ جزیرہ پر جرمنی کا قبضہ ہوجائے، لیکن اس کے بعد بڑا سخت مرحلہ قبرص کا ہے یہ جزیرہ چونکہ برطانوی مقبوضہ ہے اور سواحل فلسطین کے سامنے واقع ہے، اس لئے یہاں برطانوی طیاریاں بڑی زبردست پائی جاتی ہیں اور اگر کریٹ کے بعد جرمن افواج نے قبرص کا رُخ کیا جو بالکل یقینی بات ہے تو نازی افواج کو نہایت مضبوط آہنی دیوار کو توڑنا پڑے گا

حقیقت یہ ہے کہ ہٹلر کو اب انگلستان کی طرف سے مایوسی ہوگئی ہے اور صدر امریکہ نے حال ہی میں جو بیان شایع کیا ہے

اس نے اٹلانٹک میں بھی اس کی امیدوں کو ختم کر دیا ہے، اس لئے وہ اب ایشیا کی طرف بڑھے گا اور اگر اس نے قبرص فتح کر لیا تو اس میں شک نہیں کہ فلسطین اور نہر سویز دونوں سخت خطرہ میں پڑ جائیں گے، لیکن بحر روم میں برطانیہ کی بڑھی ہوئی بحری طاقت کو دیکھ کر، نازی کامیابی دشوار نظر آتی ہے

برلن سے بغداد تک کا خواب، جرمنی کا بڑا دیرینہ خواب ہے اور اگر ترکی روس کا قدم درمیان نہ ہوتا تو شاید یہ تمنا اسکی پوری ہو چکی ہوتی، لیکن اب یونان کی فتح کے بعد وہ روس و ترکی دونوں سے بے تعلق ہو کر براہ شام، بغداد تک پہونچنا چاہتا ہے لیکن جرمنی کا اس اسکیم میں کامیاب ہونا نہ صرف اس لئے دشوار ہے کہ بحر روم اور خلیج فارس سے برطانیہ کو ہر قسم کی مدد آسانی سے پہونچ سکتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ شاید روس اسے گوارا نہ کرے

اس میں شک نہیں کہ روس کا طرز عمل اس وقت تک بالکل مبہم بنا ہوا ہے اور ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ جرمنی کے ساتھ اس کا معاہدہ کس حد تک اسے غیر جانبدار رکھ سکتا ہے، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ اس کا موجودہ تذبذب اب زیادہ عرصہ تک قایم نہیں رہ سکتا اور روس کو ادھر یا ادھر جلد فیصلہ کرنا پڑے گا

حال ہی میں دو خبریں بہت عجیب و غریب آئی ہیں، ایک یہ کہ روس نے ایران و افغانستان سے چند ہوائی مرکزوں کا مطالبہ کیا ہے اور دوسرے یہ کہ بحر اسود یا پولینڈ میں اسٹالین اور ہٹلر کی ملاقات ہونے والی ہے، اگر یہ خبریں صحیح ہیں تو اسکے معنے صرف یہ ہیں کہ روس و جرمنی میں اب ایشیا کے متعلق کوئی گفتگو ہونے والی ہے

اس سے پہلے روس و جرمنی میں جو سمجھوتا ہوا تھا، اس کا صحیح علم تو خیر کسی کو نہیں، لیکن اس کی نوعیت سب پر ظاہر ہو چکی ہے۔ روس کا مشرقی پولینڈ ریاستہائے بالٹک اور بسرابیا وغیرہ پر قابض ہو جانا گویا قیمت تھی اس بات کی کہ روس کی طرف سے خام پیداوار اور پٹرول جرمنی کو پہونچتا رہے گا اور یوروپ میں نازی اقدامات کو گوارا کیا جائے گا

لیکن جب نازی فوجوں کا رُخ بلقان کی طرف ہوا، تو روس نے اس کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا، اور یونان فتح ہونے کے بعد تو اُسے قدرتاً اور زیادہ فکرمند ہو جانا چاہئے، کیونکہ بالٹک سمندر کا راستہ، ڈنمارک اور ناروے پر جرمن قبضہ کی وجہ سے پہلے ہی اس کے لئے خطرناک ہو گیا تھا اور اب بحر اسود اور درۂ دانیال کے راستہ پر بھی جرمن پہرہ بٹھنے والا ہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہو سکتے کہ روس، جرمنی سے لڑنے پر طیار ہو جائے، اُس نے یہ ضرورت یقیناً محسوس کی ہوگی کہ ایشیا کی طرف نازی پیشقدمی سے جو خطرات اس کے لئے پیدا ہو رہے ہیں ان کا سدباب کرے، لیکن ہٹلر جانتا ہے کہ اسٹالین کو خاموش رکھنے کا کیا طریقہ ہے اور اسٹالین بھی اچھی طرح واقف ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ عراق کے ساتھ روس نے جو معاہدہ کیا ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایشیا میں اپنی پالیسی علٰحدہ متعین کرنا چاہتا ہے اور سائبیریا کی فوجوں کا وسط ایشیا کی طرف منتقل کیا جانا اور ایران و افغانستان سے ہوائی مرکزوں کا مطالبہ کرنا بھی اسی مصلحت کی بنا پر ہے، لیکن اس کا مقصد کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

اس وقت روس کی صنعت و حرفت بالکل جرمن کاریگروں کے ہاتھ میں ہے اور وہ جرمنی کے مقابلہ میں آنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا، اس لئے زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ جرمنی سے بعض ناجایز مراعات ایشیا میں حاصل کرے گا اور موصل و بغداد کی طرف اس کی راہ میں حایل نہ ہوگا

ترکی کے متعلق بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اب وہ بھی جرمنی کے خلاف میدان میں آجائے گا، لیکن یہ خیال بالکل حالات کے خلاف قایم کیا گیا تھا۔ اگر ترکی کو لڑنا ہوتا تو وہ اسی وقت میدان میں آجاتا، جب بلغاریا میں نازی فوجیں داخل ہوئی تھیں لیکن جب ترکی نے اس کو بھی گوارا کرلیا اور حسب معاہدہ یونان کی بھی کوئی مدد نہیں کی، تو پھر ترکی کے میدان میں آنے کی صورت صرف یہی ہوسکتی ہے کہ خود اس پر حملہ کیا جائے اور ہٹلر یہ کرنے کا نہیں، کیونکہ فی الحال ترکی اور روس سے بگاڑنا اسکے مفاد کے خلاف ہے

اس میں شک نہیں کہ یونان فتح ہونے کے بعد بحرِ ایجین میں ترکی و روسی جہازوں کی آمدورفت بالکل جرمنی کے رحم وکرم پر موقوف ہوگئی ہے اور مغرب سے ان کا تعلق بالکل منقطع ہوگیا ہے، لیکن وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جنگ کی یہ درمیانی منزلیں ہیں اور جلد یا بدیر ان میں ضرور کوئی نہ کوئی تغیر پیدا ہوگا اور برطانیہ کی بحری قوت زیادہ عرصہ تک حالات کی موجودہ صورت کو قایم نہ رہنے دے گی

ہر چند جنگ اب ایک فیصلہ کن دور سے گزر رہی ہے، لیکن ہمیں امید نہیں کہ آیندہ موسم سرما تک یہ دور ختم ہوجائے، کیونکہ ابھی ہٹلر کو بحرِ روم میں بھی بہت سی کڑی منزلیں جھیلنا ہیں اور اٹلانٹک میں بھی برطانیہ کی قہاریت کا مقابلہ کرنا ہے

اس کے جہاز بسمارک کا غرق ہونا اور ساتھ ہی ساتھ صدر امریکہ کا برطانیہ کی حمایت میں جنگ تک کے لئے آمادہ ہوجانا، ایسی معمولی بات نہیں کہ ہٹلر اس سے متاثر نہ ہو اور اٹلانٹک کی طرف سے مطمئن ہوکر وہ اس جنگ کو جاری رکھ سکے

ہٹلر کی فتوحات جتنی وسیع ہوتی جاتی ہیں، اتنے ہی زیادہ امکانات اس کی ناکامی کے قوی ہوتے جارہے ہیں۔ مانا کہ نازی حکومت اس وقت بہت عروج پر ہے، اس کا سارا ملک فوج ہے، اس کی فضائی قوت کا مقابلہ اسوقت کوئی نہیں کرسکتا جسوقت وہ حملہ کرتا ہے تو اس کے ٹینکوں اور اس کی سپاہ کے مردانہ اقدام کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا، لیکن پھر بھی ہر چیز کی ایک حد ہوا کرتی ہے، ہر قوت کا ایک انتہائی نقطۂ عروج ہوتا ہے۔ اور جب ان حدوں سے ایک قوم گزر جاتی ہے تو پھر اس کا زوال یقینی ہے آج ہٹلر، ناروے سے لیکر یونان تک اور رومانیا سے لیکر فرانس و ڈنمارک تک سارے یوروپ پر قابض ہے، لیکن کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان تمام ملکوں پر قابض رہنا آسان بات ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت کہاں کہاں اور کتنی تعداد میں جرمن افواج متعین ہیں اور اُن کے مصارف کا بار ملک پر کتنا پڑ رہا ہے۔ پھر سوچئے کہ یہ حالت کب تک جاری رہ سکتی ہے اور جرمن ذرا لعکب تک اس کو برداشت کرسکتے ہیں

لڑائیوں میں اہم سوال وقتی کامیابی کا نہیں ہوتا، بلکہ کامیابی کو قایم رکھنے اور اقتصادی مشکلات کے برداشت کرنے کا ہوتا ہے

پھر ہوسکتا ہے کہ اس وقت وہ عراق، فلسطین، قبرص، سویز، بلکہ ایران و افغانستان تک پھیلتا جائے، لیکن کیا وہ اس پھیلاؤ کے دباؤ کو عرصہ تک برداشت کرسکتا ہے اور کیا اس بوجھ کے نیچے اس کے پس جانے کا قوی امکان نہیں ہے؟ ہے اور برطانیہ شاید اس وقت کا انتظار کر رہا ہے۔

شاد عارفی کی غزل گوئی

شاد عارفی کو غزل اور نظم دونوں اصناف سخن میں جو درجہ حاصل ہے کم لوگوں کو اس کی خبر ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ابھی دیوان کی صورت میں اُن کے کلام کا کوئی مجموعہ شایع نہیں ہو سکا ہے۔ "ساقی" اور "ہایوں" میں ان کا کلام شایع ہوتا رہتا ہے، اس لئے تعجب ہے کہ ہمارے مہربان جناب نیاز اپنے "نگار" کے شاعری نمبر کے لئے شاد صاحب کا کلام حاصل نہ کر سکے۔[1] اب میں جناب شاد عارفی کے کلام کا مختصر سا انتخاب پیش کرتا ہوں۔

ہلکا سا تبسم ترے لب ہائے حسیں پر مجبور نہ کر مجھ کو محبت کے یقیں پر

ہلکے سے تبسم کے ساتھ محبت کے یقین پر مجبور کرنا، یہ بیان اُسی قسم کی چیزوں میں سے ہے جو اُردو کی موجودہ شاعری کو پُرانی شاعری سے ممتاز کرتی ہیں[2]

حق ہے کہ ستاؤ مگر اتنا نہ ستاؤ پڑ جائے مری آنکھ کسی اور حسیں پر

شاعر کو معلوم ہے کہ اُس کی آنکھ کسی اور حسیں پر نہیں پڑنے کی، لیکن چونکہ محبوب کو اس بات کا احتمال رہتا ہے، اس لئے شاد صاحب نے یہ شاعرانہ "چال" چلی جو ممکن ہے مومن سے سیکھی ہو۔ ایک جگہ اور کہتے ہیں:-

ہو اجازت تو کسی اور کو دل نذر کروں، ہو اگر حکم تو جینے کا سہارا کر لوں[3]

---

[1] افسوس ہے کہ آپ نے اس اُصول کو نہیں سمجھا جس کی بنا پر میں نے شعراء کا انتخاب کیا تھا۔ میں نے صرف دو قسم کے شاعروں کو لیا تھا۔ ایک وہ جو بہت کہنہ مشق ہیں اور اُستادانہ حیثیت ان کی تسلیم کر لی گئی ہے (خواہ وہ خوشگو ہوں یا نہ ہوں)، دوسرے وہ نظم نگار شعراء جو بہت زیادہ مشہور ہو چکے ہیں، لیکن ان کی شاعری کی ابتدا غزلوں ہی سے ہوتی ہے۔ اب بتایئے کہ شاد عارفی ان دو میں سے کس تقسیم میں آتے ہیں۔ اُن کی اُستادانہ حیثیت (جلیل و بیخود وغیرہ کی طرح مسلم نہیں) مسلم نہیں اور شہرت کے متعلق آپ خود فرماتے ہیں کہ لوگ اُن سے کم واقف ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ شاد عارفی کیا بہت سے اچھے کہنے والے نوجوان اس قابل ہیں کہ ان کا انتخاب شایع کیا جائے، لیکن میں نے جس اُصول کو سامنے رکھکر جنوری ۴۱ء کا نگار شایع کیا تھا اس کو سامنے رکھ کر مجھ پر یہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ پھر میں نے ان کو کیوں چھوڑ دیا۔

[2] شاعری سے مراد شاید آپ کی غزلگوئی ہے۔ لیکن پُرانی غزلگوئی اور نئی غزلگوئی کا فرق جب تک ظاہر نہ کیا جائے، اس شعر کو نئی شاعری کی چیز قرار دینا جبکہ متقدمین کے یہاں بھی اس رنگ کے شعر بکثرت نظر آتے ہیں، عجیب بات ہے!

[3] پہلے مصرعہ میں جس بات کی اجازت چاہی جاتی ہے، اس کے لئے دوسرے مصرعہ میں حکم چاہا جاتا ہے اور یہ معنوی سقم ہے۔ علاوہ اس کے جب پہلے مصرعہ میں اجازت طلبی کی رسم ادا ہو چکی تھی تو دوسرے مصرعہ میں اس مفہوم کی تکرار ہونا ہی نہ چاہئے تھی۔

ایک جگہ اس طرح خفا ہوتے ہیں کہ محبوب دھوکا کھا جائے، یعنی یہ متعین نہ کر سکے کہ عاشق خفا ہے یا خوشامد کر رہا ہے۔

کبھی سامنے تم نہ آؤ نہ آؤ ؛ اگر خوش رہو مجھ سے مستور ہو کر

مراد یہ کہ تم ایسا کرو گے تو میں جانتا ہوں کہ تم خوش نہ رہ سکو گے[1]

چھائی ہوئی افکار پر کیفیت عرفاں چاہوں تو ستارے بھی اُتر آئیں زمیں پر

شعر کی جان اُس کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ سانچے میں ڈھلا ہوا ہو۔ یہ صفت شاد کے شعر کے دوسرے مصرع میں اپنے کمال پر ہے[2]

میرے لئے وہ موردِ الزامِ محبت ! آتا ہے ترس شاد مجھے حسنِ حزیں پر

بحیثیت عاشق شاد صاحب کی یہ کامیابی یقیناً قابلِ رشک ہے لیکن "حُسنِ حزیں" کی ترکیب اس سے زیادہ خوش قسمتی کی بات ہے۔

میں پریشاں ہوں طبیعت اُسکی ہو نا ساز بھی ربطِ حسن و عشق کا قایل ہے اب ہمراز بھی

"ہمراز" عشق کی روحانیت کا بہت زیادہ وہ قایل نہیں تھا اُس کے نزدیک حُسن کو متاثر کرنا ایک آرٹ ہے جو محض جذبات کی صداقت سے تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن شاد نے اسے ثابت کر دکھایا۔ یہ بیچ کی کڑی کا حذف کر جانا اور صرف کسی ایک واقعہ یا کیفیت سے مطلب واضح کرنا شاد کی غزل گوئی کا خاص رنگ ہے[3]۔

بے سبب دلکش نہیں ہیں نغمہ ہائے ساز بھی سازمیں ہے ایک پہچانی ہوئی آواز بھی

یعنی "پہچانی ہوئی آواز" میں نغمہ کی ساری دلکشی پنہاں ہے[4]

اے تصور، اے خیالِ دوست، یہ اعجاز بھی صورتِ پیشِ نظر کو زحمتِ آواز بھی،

اس شعر میں جس نازک موقعہ کی نقاشی کی گئی ہے وہ اُن کیفیتوں میں سے ہے جن کے اظہار سے انسان کی قوت گویائی اکثر عاجز رہتی ہے۔ آرٹ کی دنیا میں "مقصد" کو اب بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ صرف چوٹی کے آرٹسٹ اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ شاد صاحب اس مضمون کی ادائی میں جس طرح کامیاب ہوئے ہیں وہ اُن کو اول درجہ کے شاعروں کی صف میں جگہ دلانے کے لئے کافی ہے۔

میں اگر چُپ ہوں سکونِ درد کے طعنے نہ دو ایسی چُپ کا نام ہے فریادِ بے آواز بھی

حُسن و عشق کے معاملات "جفا و وفا" تک محدود نہیں ہیں اس سلسلے میں اور بھی بہت سی حالتیں گزرتی ہیں۔ شاد صاحب نے غزل کے دامن کو اس طرح وسیع کیا کہ اُنھوں نے وہ سارے واقعات جو اُنھیں پیش آئے قلمبند کر دئے۔ اُن کی غزلیں اُن کے عشق کی تاریخ ہیں۔

---

[1] اگر کی جگہ مگر کے استعمال سے ہلکا سا طعن بھی شامل ہو جاتا زیادہ موزوں تھا۔ [2] لیکن پہلا مصرعہ ؟

[3] شعر بُرا نہیں ہے، لیکن پہلے مصرعہ میں ردیف کا استعمال غلط ہوا ہے۔ اصل میں ہونا یہ چاہئے تھا کہ "میں پریشاں ہوں، طبیعت اسکی بھی نا ساز ہے" لیکن مطلع بنانے کی کوشش میں یہ بات شاد صاحب کے ذہن سے اُتر گئی کہ بھی کا تعلق یہاں بجائے محبوب کے نا ساز سے ہو گیا۔

[4] یہ درست ہے، لیکن پہلے مصرعہ میں ردیف بیکار ہو گئی۔ بھی کو اُڑا دیجئے تو بھی مطلب پورا ہو جاتا ہے۔

جیسے کوئی مست اُٹھنا چاہے اور اُٹھا نہ جائے اُٹھ رہی ہے اس تکلف سے وہ چشمِ ناز بھی

مارچ ۴۱ء کے نگار میں شادؔ صاحب کی ایک غزل چھپی تھی۔ اُس کے ایک شعر کا مصرعہ ثانی ہے:

"چمن سمٹ کے چھا گیا ہے اُس کی خوابگاہ پر"

اُس شعر کی نقاشی آخر مدیر نگار سے خراجِ تحسین وصول کر کے رہی۔ یہ موجودہ شعرا اپنے اندر نقاشی کی وہی دنیا لئے ہوئے ہے[۱]۔

چند ایک اور اشعار اسی رنگ کے ملاحظہ ہوں:

قدم قدم پہ وہ انگڑائیاں خمار شکن، ٹھہر ٹھہر کے پلائی گئی شراب مجھے

(پاکیزہ شعر ہے۔ نیاز)

کسی کی مست نگاہوں سے لڑ رہی ہے نظر برس رہا ہے مرے دل پہ کیف پیمانہ[۲]

میری حالت دیکھنے آتے ہیں اس انداز سے جیسے میں سنتا نہیں ہوں پاؤں کی آواز بھی

حقیقت یہ ہے کہ محبوب کی فطرت کی گہرائیوں تک شادؔ صاحب کی نظریں خوب پہونچتی ہیں[۳]۔

ہجومِ غم میں نہیں عشرتوں کی تاب مجھے نہ مسکرا کے عطا ہو کوئی جواب مجھے،

وہی لوگ کچھ اس شعر کی خوبی کا اندازہ کر سکتے ہیں جنھیں اس میں بجائے سوداؔ کے شاہانہ لہجے کے میرؔ کا دردناک لہجہ نظر آتا ہے۔ انشاء اللہ خاں کے مشہور شعر کی "نگہت بادِ بہاری" اور اس شعر کے "کسی کے مسکرا کے جواب دینے" کا فرق ناظرین خود محسوس کریں۔ (واقعی شعر خوب ہے۔ نیاز)

کیا بتائیں دل کی کمزوری کا حال، آپ جب یاد آئے آنسو بہہ گئے

کتنا سانچے میں ڈھلا ہوا اور کیفیت سے لبریز شعر ہے! (شعر اچھا ہے۔ نیاز)

وہ برابر سے نکل کر چلدئے دامنِ خوشبو میں جلوے رہ گئے

"دامنِ خوشبو میں جلوے رہ گئے" اُردو زبان میں بالکل نئی چیز ہے[۴]۔ حق یہ ہے کہ نادر سے نادر بات شادؔ کی زبان میں اس طرح ادا ہو جاتی ہے گویا عرصے سے لوگ اسی طرح اُسے ادا کرتے رہے ہیں۔ یہی بات غالبؔ کے اخیر زمانے کی غزلوں میں پائی جاتی ہے۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۹۴ پر ملاحظہ ہو)

---

[۱] شعر واقعی بہت اچھا ہے، لیکن ردیف یہاں بھی بیکار ہے۔ اگر اُس کی جگہ اُسی ہوتا تو یہ عیب پیدا نہ ہوتا۔

[۲] کیف کے ساتھ پیمانہ کی خصوصیت کوئی معنی نہیں رکھتی، اس لئے لفظ پیمانہ بیکار ہے اگر پیمانہ کے بجائے رندانہ ہوتا تو کیف کی نسبت درست ہو جاتی

[۳] بھی، یہاں بھی کوئی معنی نہیں دیتا۔ اس انداز سے کیا مراد ہے، غالباً دبے پاؤں آنا مراد ہے یا پھر پورے ہنگامہ کے ساتھ۔ اور دوسرا مصرعہ دونوں صورتوں میں درست نہیں۔ شاعر غالباً یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ مجھ سے چھپ کر میری حالت دیکھنے آرہے ہیں، لیکن کیا میں ان کے پاؤں کی آواز بھی نہیں پہچان سکتا لیکن یہ مفہوم شعر سے ظاہر نہیں ہوتا۔ [۴] نئی چیز ہے لیکن غلط۔ دامنِ خوشبو کی ترکیب جس معنی میں یہاں استعمال کی گئی ہے، درست نہیں ہے کیونکہ فارسی میں خوشبو کے معنے اچھی بُو رکھنے والے کے ہیں اور شادؔ صاحب نے اُسے "بوئے خوش" کے معنے میں لیا ہے۔ اس معنے میں یہ لفظ یہاں اُردو ہے اور اسے اضافی ترکیب کے ساتھ استعمال نہیں کر سکتے۔ دامنِ بو، دامنِ بوئے خوش تو صحیح ہیں لیکن "دامنِ خوشبو" صحیح نہیں۔ فارسی ترکیب کے لحاظ سے دامنِ خوشبو کے معنے ہوں گے "اچھی بو رکھنے والا دامن"

تاریخ اودھ کا ایک ورق

بادشاہ بیگم

(مسلسل)

(۴)

(غازی الدین حیدر کی وفات، نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی، بادشاہ بیگم اور بادشاہ میں مناقشہ)

۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ کو سلطنت اودھ کے پہلے باضابطہ بادشاہ غازی الدین حیدر نے انتقال کیا اور ساڑھے نو بجے رات کو سلیماں جاہ نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے اور خطبہ و سکہ جاری ہوا۔

عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ معتمد الدولہ سے بادشاہ خوش نہیں ہیں، لیکن تخت نشینی کے وقت بادشاہ نے خاص عنایات ان پر صرف کیں، وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر بحال رکھا اور شاہی خزانہ پر پورا اختیار دیدیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے خوب دل کھول کر تغلب کیا اور بیش قیمت جواہرات سے گھر بھر لیا۔

۲۰ جمادی الاول ۱۲۴۳ھ کو جب لارڈ کمبرمیر سلطنت اودھ کا معائنہ کرنے آئے تو دعوت کے بعد جہاں پناہ نے ان سے کچھ باتیں تخلیہ میں بھی کیں، اس صحبت میں رزیڈنٹ کے سوا کسی شخص کو شریک نہیں کیا گیا اور بادشاہ بیگم کے مشورہ سے جہاں پناہ نے یہ بھی کہدیا کہ سلطنت کی تمام خرابیوں کی ذمہ داری معتمد الدولہ پر عاید ہوتی ہے اور بغیر اُن کی گرفتاری و حراست کے سلطنت کے اُمور سدھر نہیں سکتے۔ لارڈ کمبر نے جواب دیا کہ جہاں پناہ کو سلطنت کے اندرونی معاملات و نظم و نسق میں کلی اختیار حاصل ہے، ملازمین شاہی کا تقرر، تنزل اور سزا بالکل اُن کے اختیار میں ہے اور رزیڈنٹ کے سامنے معتمد الدولہ کی گرفتاری کی بھی اجازت دیدی۔ اس معاملہ میں اس درجہ رازداری سے کام لیا گیا کہ آخر وقت تک معتمد الدولہ کو مطلق علم نہ ہوا، اس وقت تک میر فضل علی اور اُن کی خالہ فیض النساء مغلانی، کمپنی کے علاقوں میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بادشاہ بیگم نے اُن کو طلب کیا اور محل میں پوشیدہ رکھا حتیٰ کہ معتمد الدولہ کو بھی اس امر کی مطلق اطلاع نہ ہوئی۔ جب یہ لوگ جلاوطنی سے واپس آئے تو تیسرے دن محل کی ڈیوڑھی پر بھی دیکھے گئے اور لوگوں نے اُن کو پہچانا اور یہ خبر سارے شہر میں مشہور ہوگئی معتمد الدولہ بہت پریشان ہوئے، لیکن بادشاہ نے واقعات سے مطلق لاعلمی ظاہر کی اور یقین دلایا کہ "وزارت عظمیٰ کا عہدہ اُنھیں کے پاس رہے گا، کلکتہ سے اجازت طلب کی گئی ہے، میر فضل علی، بادشاہ بیگم کی ڈیوڑھی کا داروغہ تھا وہ کسی خاص کام سے آیا ہوگا، اس کو سلطنت کے امور سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔

بادشاہ، معتمد الدولہ کو خطوط میں پیارے بھائی، لحمک لحمی و دمک دمی لکھتے تھے، ۱۰ جمادی الثانی کو نیابت کا خلعت فاخرہ

علی الصباح نکالا گیا۔ پہلے بادشاہ نے چوبدار کے ذریعہ سے رزیڈنسی ایک خفیہ خط بھیجا جس میں ہدایت تھی کہ آغا میر کو رزیڈنسی میں گرفتار کرلیا جائے۔ جب رزیڈنسی سے خط کا جواب آگیا تو بادشاہ نے معتمد الدولہ کو طلب کیا اور خلعت دکھلایا اور کہا کہ پہلے تم رزیڈنٹ کے پاس جاکر کچھ سیاسی امور میں گفتگو کرلو اور واپسی پر خلعت نیابت کے مراسم میں شریک ہو۔ معتمد الدولہ مطمئن ہوگئے اور جیسے ہی رزیڈنٹ نے گفت وشنید شروع کی حراست میں لے لئے گئے۔ معتمد الدولہ نے رزیڈنٹ سے دریافت کیا تو اس نے کل واقعہ بیان کر دیا اور وہ شاہی خطوط بھی دکھلا دئے جن کی رو سے اُن کی حراست عمل میں آئی تھی۔

نواب معتمد الدولہ نے نہایت عاجزی سے رزیڈنٹ سے عزت و آبرو بچانے کی استدعا کی، رزیڈنٹ نے امداد کا وعدہ کیا اور ہاتھی پر بٹھلا کر انگریزی سپاہیوں کی حراست میں اُن کی محل سرا بھجوا دیا۔ اُسی دن جہاں پناہ نے معتمد الدولہ کے اعزہ، احباب اور متوسلین کے مکانات پر پہرہ بٹھلا دیا اور ۳ دن تک شہر میں بڑا ہنگامہ رہا۔ شہر کے بدمعاشوں نے بہت سے مکانات نواب معتمد الدولہ کی املاک سمجھ کر لوٹ لئے۔ آخر کار رزیڈنٹ کے اشارہ پر ہنگامہ فرو ہوا اور اُسی دن وزارت عظمیٰ کا خلعت میر فضل علی کو دیا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ بیگم نے رزیڈنٹ کو ایک خط لکھا جس میں آغا میر کو حوالہ کرنے کی استدعا کی تھی تاکہ اُن کی غداریوں کی پاداش میں عبرت ناک سزا دی جائے لیکن رزیڈنٹ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا، گو بادشاہ روزانہ صبح و شام دونوں وقت بادشاہ بیگم کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور اُن کے احکام کی پابندی کرنا اپنی سعادت تصور کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی میر فضل علی اور فیض النساء کے اثرات سلطنت کے امور میں انھیں پسند نہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میر فضل علی کو اپنی جگہ سے علٰحدہ ہونا پڑا۔ ان کے بعد وزارت، اقبال الدولہ خلف فتح علی خاں، راجہ رام دیال اور جعفر علی خاں کو تفویض کی گئی، لیکن اپنی ناتجربہ کاری سے یہ لوگ بھی جلد ہٹا دئے گئے اور بادشاہ نے، حکیم مہدی علی خاں منتظم الدولہ کو فرخ آباد سے طلب کرکے وزارت کا بار گراں اُن کے سر پر رکھا۔ منتظم الدولہ کفایت شعار، متین اور تجربہ کار تھے۔ ۱۰ جمادی الثانی ۱۲۴۶ھ کو منتظم الدولہ نے اپنے عہدہ کا جایزہ لیا اور کفایت شعارانہ اُصول پر نظم و نسق شروع کیا، لیکن بادشاہ بیگم چونکہ مذہبی بدعات پر بہت فضول روپیہ خرچ کرنا چاہتی تھیں، اس لئے ان دونوں کے تعلقات کشیدہ ہوگئے۔ منتظم الدولہ بھی دبی زبان سے ان واقعات کا ذکر بادشاہ سے کرتے رہتے تھے، لیکن بادشاہ کوئی دخل نہ دیتے تھے

اس زمانہ میں جہاں پناہ کی توجہ ایک عورت کی طرف ہوگئی، جس کا نام بسم اللہ بیگم تھا۔ بادشاہ نے اس کو "نواب محذرۂ زماں، بلقیس دوراں، ملکۂ آفاق قدسیہ سلطان مریم بانو بیگم" کا خطاب عطا کیا۔ جب بسم اللہ بیگم یا قدسیہ بیگم کو معلوم ہوا کہ بادشاہ کو فرزند نرینہ کی خواہش ہے تو انھوں نے حاملہ ہونے کا بہانہ کیا، بادشاہ کو بھی دھوکہ ہوگیا اور تمام بیگمات پر اُن کو برتری حاصل ہوگئی جہاں پناہ ہر امکانی کوشش اُن کو خوش کرنے کی کرتے تھے، شروع میں قدسیہ بیگم اور بادشاہ بیگم کے تعلقات بہت عمدہ تھے، لیکن بعد میں مناقشات شروع ہوئے حتیٰ کہ روبرو سخت کلامی کی بھی نوبت آگئی۔

فرضی حمل کی مدت ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک شب قدسیہ بیگم نے بادشاہ سے کہا کہ آیندہ ہونے والا بچہ کو حقیقی وارث سلطنت ہوگا لیکن سنا ہے کہ جانشینی سے محروم رہیگا کیونکہ رسم یہ ہے کہ اولاد اکبر جانشین ہوتی ہے اور جہاں پناہ نے بادشاہ بیگم کی ایما پر فریدوں بخت (مناجہان) کو اپنا جانشین تسلیم کرلیا ہے اور اس امر سے کمپنی بہادر کو بھی مطلع کر دیا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ قبل از وقت اس ناجایز جانشینی کو رد کا جائے۔

اتفاق سے عین اسی وقت فریدوں بخت کی جانشینی کے متعلق گورنر جنرل نے ایک تحقیقاتی کمیٹی کے انعقاد کا حکم صادر کر دیا۔ اب وقت آگیا تھا کہ بادشاہ، اپنی ماں بادشاہ بیگم کے اثر سے بھی آزاد ہو جائیں، چنانچہ انھوں نے رزیڈنٹ کے استفسار پر صاف صاف کہدیا اور اعلان کر دیا کہ:

"قبل اس کے کہ میں سن بلوغ کو پہونچتا، بادشاہ بیگم نے ایک مجہول النسب کو (جو دراصل دھوبن کے بطن اور میر فضل علی یا کسی دوسرے شخص کے نطفہ سے تھا) متبنی کر لیا۔ اس لئے اعلان کیا جاتا ہے کہ آیندہ کوئی لڑکا میری موجودہ بیگمات سے ہو تو وہ میرا جایز جانشین تسلیم کیا جائے گا، اسی کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا جاتا ہے کہ جب منا جان کی سواری نکلے تو لوگ سلام نہ کریں"۔

گورنر جنرل نے اس اعلان کے بعد جہاں پناہ کو لکھا کہ:

"بادشاہ کی تحریر سے پتہ چلا ہے کہ آپ ابتک لاولد ہیں اس لئے آیندہ جانشین نواب سعادت علی خاں کا بڑا لڑکا ہوگا"

جہاں پناہ نے اس اعلان کو رومی دروازہ پر چسپاں کرا دیا جس سے سب کو عیاں ہو گیا کہ فریدوں بخت جہاں پناہ کے لڑکے نہیں ہیں۔

نائب (منتظم الدولہ) کچھ واقعات بادشاہ بیگم کے خلاف جہاں پناہ کی سماعت میں لائے لیکن قبل اس کے کہ بادشاہ بادشاہ بیگم کے خلاف ہوتے، ۷ ربیع الاول ۱۲۴۶ھ کو بادشاہ بیگم کے اشارہ پر منتظم الدولہ کا زوال ہو گیا اور ۴ جمادی الثانی کو "روشن الدولہ" اُن کے جانشین ہوئے۔ انھوں نے سبحان علی خاں کو اپنا نائب بنایا۔ اب بادشاہ نے کھلم کھلا بادشاہ بیگم کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار شروع کر دیا۔ اس وقت تک جہاں پناہ بادشاہ بیگم کی خدمت میں روزانہ حاضری دیا کرتے تھے لیکن اب دوسرے تیسرے دن جانے لگے۔ اس زمانہ میں بادشاہ بیگم کے تعلقات قدسیہ بیگم سے بھی خراب ہو گئے اور روزانہ نئے نئے جھگڑے ہونے لگے قدسیہ بیگم اس کو برداشت نہ کر سکیں اور زہر کھا کر جان دیدی۔ یہ واقعہ ۱۵ ربیع الثانی ۱۲۵۰ھ کا ہے، مرنے کے بعد زہر کی پڑیا اُن کے دوپٹہ میں بندھی ہوئی ملی۔

جہاں پناہ کو اس حادثہ سے بڑا صدمہ ہوا، اور کئی وقت کھانا نہ کھایا۔ جب بادشاہ بیگم نے یہ سنا تو وہ آئیں اور سمجھایا کہ رنج بیکار ہے، خدا نے اُس سے کہیں زیادہ حسین و جمیل عورتیں پیدا کی ہیں، ایسی بے وفا کے لئے کڑھنا بیکار ہے۔ جہاں پناہ بادشاہ بیگم سے ناراض تھے ہی، اس گفتگو نے آگ پر اور تیل چھڑک دیا۔ بولے "میر فضل علی کے انتقال پر آپ کو کس درجہ ملال ہوا تھا، اگر آپ کو میرے ساتھ مادرانہ محبت ہوتی تو آج سوگ کے لباس میں تشریف لاتیں لیکن آپ کو محبت کیوں ہونے لگی، کیونکہ آپ میری حقیقی ماں نہیں ہیں"۔

بادشاہ بیگم نے جواب دیا کہ "میں نے سیاہ لباس، سوا سید الشہدا کے سوگ کے کبھی نہیں پہنا اور نہ کبھی پہنوں گی۔ غازی الدین حیدر اور نواب سعادت علی خاں کے انتقال پر بھی ہمارے خاندان میں کسی نے سیاہ لباس نہیں پہنا"۔ اور یہ کہکر غصہ میں بھری ہوئی بادشاہ بیگم اپنے محل واپس تشریف لے گئیں۔

اب جہاں پناہ نے بادشاہ بیگم کو پریشان کرنا شروع کیا اور حکم دیا کہ وہ محل خالی کر دیں، بادشاہ بیگم نے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ یہ محل اُن کے شوہر شاہ زمن غازی الدین حیدر نے عطا کیا تھا اور اس لئے اُس کا خالی کرنا ناممکن ہے،

اب جہاں پناہ نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ ۲۰ یا ۲۵ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ لے لیا کریں اور شہر کے جس مکان کو پسند کریں وہاں جاکر قیام کریں، لیکن بادشاہ بیگم نے اس تجویز کو بھی پسند نہ کیا اور جواب دیا کہ میں ماہوار تنخواہ لینا نہیں چاہتی، لیکن اگر جہاں پناہ کا منشا یہی ہے کہ میں محل خالی کر دوں تو اس شرط پر طیار ہوں کہ سلطان کی جاگیر جو شاہ زمن نے مجھ کو دی تھی اور جہاں پناہ نے بھی دی تھی وہ مجھے واپس دیجائے اور اس معاملہ کی ذمہ داری رزیڈنٹ لیں۔

جہاں پناہ نے رزیڈنٹ سے کل واقعہ بیان کیا اور کہا کہ اگر آپ کی مدد سے بادشاہ بیگم مع اپنی جملہ املاک منقولہ کے دوسری کسی عمارت میں منتقل ہو جائیں تو آپ جو رقم ماہوار مقرر کریں گے وہ ماہ بماہ ادا کرتا رہوں گا، جہاں پناہ نے متعدد بار رزیڈنٹ سے استدعا کی لیکن اُنھوں نے نجی معاملات میں دخل دینے سے انکار کر دیا اور یہ بھی کہا کہ صدر دفتر (کلکتہ) سے مجھکو محض سیاسی امور میں دخل دینے کا اختیار حاصل ہے اس لئے ان حالات میں کسی ذاتی معاملہ میں دخل دینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اب جہاں پناہ کی ناراضگی اس حد تک بڑھ گئی کہ نو تعمیر عمارتوں میں جو مزدور کام کرتے تھے، اُن کو حکم دیا گیا کہ وہ بغیر کسی اطلاع کے اندر چلے جایا کریں تاکہ بادشاہ بیگم کی بے پردگی ہو، یہ لوگ فحش گوئی سے بھی پرہیز نہ کرتے تھے، تاکہ بادشاہ بیگم عاجز آکر محل کو خالی کر دیں، لیکن بادشاہ بیگم نے غیر معمولی استقلال کا ثبوت دیا۔ اور خادماؤں سے منع کر دیا کہ خبردار کسی بات کا جواب نہ دیا جائے جب بادشاہ کو اس طرح بھی کامیابی نہ ہوئی تو ملازمان کو حکم دیا کہ وہ مٹی کے برتنوں میں بول و براز رکھکر محل کے اندر پھینکیں، اس سے بادشاہ بیگم کو سخت اذیت ہوئی اور وہ مجبوراً دوازدہ اماموں کے مقبروں میں چلی گئیں اور شب و روز کلام پاک کی تلاوت میں مشغول رہنے لگیں، لیکن بادشاہ نے حکم دیا کہ مقبروں میں بھی گندگی پھینکی جائے، چنانچہ بادشاہ بیگم اپنی خادماؤں کی امداد سے خود مقبروں کو صاف کرتی تھیں اور عرصہ تک وہ ان غیر معمولی تکالیف کو برداشت کرتی رہیں۔

جب بادشاہ نے دیکھا کہ باوجود اس حد تک تنگ کرنے کے بھی مطلب پورا نہ ہوا تو انھوں نے غلام یحییٰ خاں، فتح علی خاں قندھاری رسالہ کے افسروں اور دیگر ملازمین و مصاحبین کو محل میں بھیجا کہ وہ بادشاہ بیگم کو سمجھا کر محل خالی کرا دیں اس شرط پر کہ ۲۵ ہزار روپیہ اُن کو ملتا رہیگا۔ لیکن بادشاہ بیگم راضی نہ ہوئیں اور کہلوا دیا کہ اگر مجھکو میری جاگیر واپس کر دیں اور رزیڈنٹ اُس کے ضامن ہوں، تو محل خالی کر دوں گی، ورنہ نہیں۔

جب بادشاہ اپنی تمام کوششوں میں ناکام رہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگ بادشاہ سے اپنی ماں کے ساتھ اس برتاؤ پر بہت برافروختہ ہیں، تو بادشاہ نے فرح بخش کو چھوڑ دیا اور "دولت خانہ" چلے گئے۔ اس وقت کرنل جان لو، گورنر جنرل سے ملنے کلکتہ جا رہے تھے، بادشاہ نے ایک خط مفصل واقعات کا گورنر جنرل کو لکھا اور استدعا کی کہ کمپنی اس معاملہ میں دست اندازی کرے۔ لیکن نتیجہ بادشاہ کے موافق نہ نکلا۔ اب بادشاہ نے، بادشاہ بیگم کو اور زیادہ پریشان کرنا شروع کر دیا۔ بیگم نے رزیڈنٹ سے شکایت کی تو انھوں نے مداخلت سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد بادشاہ بیگم کے محلات کا محاصرہ شروع ہوا (۲۰ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ) اور روزمرہ کی ضروریات زندگی کا بھی محل میں جانا ممنوع قرار دیا گیا۔ راجہ شیودین سنگھ نے جن کے سپرد یہ خدمت کی گئی تھی مضبوط سیڑھیاں بنوائیں تاکہ محل کی دیواروں پر سیڑھیوں کی امداد سے ملحقہ باغات میں سپاہیوں کو اُتارا جائے اور عمارت کو گرا دیا جائے۔ اب بادشاہ بیگم مغلانیوں کے ساتھ محل سے باہر آگئیں اور اُن کے حبشی غلاموں نے فوجی سپاہیوں پر اینٹوں پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ اس قضیہ میں

جب راجہ شیودین زخمی ہوئے تو انھوں نے حکم دیا کہ بادشاہ بیگم کے احترام کا بالکل لحاظ نہ کیا جائے اور سپاہی محل میں بے دریغ گھس جائیں۔ اتفاقاً اسی وقت کسی نے بندوق چلادی، اب دونوں طرف سے گولیاں چلنے لگیں اور شہر کی دوکانیں بند ہوگئیں جب بادشاہ کو یہ حال معلوم ہوا تو ایک توپ بادشاہ بیگم کے محل پر نصب کردی اور علی رضا کوتوال شہر کو حکم دیا کہ وہ عوام کے خوف وہراس کو دور کریں اور دوکانیں کھولنے کی ترغیب دیں۔ اب بادشاہ بیگم نے جو گرسنگی و تشنگی سے پست ہوچکی تھیں، راجہ شیودین سے پناہ طلب کی۔

روشن الدولہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بادشاہ بیگم الماس باغ جانے کے لئے طیار ہیں۔ جہاں پناہ نے معاً بادشاہ بیگم کے لئے سواری کے انتظام کا حکم دیا اور روشن الدولہ نے اُسی وقت ۵۰ رتھ اور ۷۰ محافہ محل پر بھیجدئے اور کوتوال شہر کو حکم دیا گیا کہ وہ فوراً سب کو ضروری سامان کے ساتھ الماس باغ بھیجدیں۔

بادشاہ بیگم نے اپنی زخمی خادماؤں کو ساتھ لیا اور غروب آفتاب کے دو گھنٹے بعد الماس باغ پہونچ گئیں، چونکہ الماس باغ کے مکانات عرصۂ دراز سے غیر آباد تھے اور روشنی وغیرہ کا بھی سامان نہ تھا، اس لئے بادشاہ بیگم اور فریدوں بخت نے وہ شب بغیر کھائے پیئے سکھ پال میں گزار دی، فتح علی خاں کپتان، بادشاہ بیگم کے محل پر گئے اور تمام کمروں کو مقفل کردیا۔ اس بلوہ میں بادشاہ بیگم کی املاک کا ایک بڑا حصہ ضایع ہوگیا۔ دوسرے دن شاہی حکم سے ملازمین شاہی نے بقیہ سامان الماس باغ منتقل کردیا اور کنیزیں بھی جو شب کو بادشاہ بیگم کے ساتھ نہ جاسکی تھیں وہ بھی الماس باغ پہونچادی گئیں۔

(۵)

(بادشاہ بیگم کا الماس باغ میں قیام۔ امام بخش کی سرکردگی میں سپاہیوں کی بھرتی اور رزیڈنٹ کی مداخلت)

جب بادشاہ بیگم نے الماس باغ میں قیام کرلیا تو امام بخش سقہ ساکن فتح گنج کو حکم دیا کہ خفیہ طور پر مسلح فوج کی بھرتی کرے۔ شروع میں تو بادشاہ اور رزیڈنٹ کو کچھ پتہ نہ چلا، لیکن بعد کو جب ان لوگوں نے شہر و مفصلات میں کھیتیاں اور باغ برباد کرنا شروع کئے تو بادشاہ نے حکم دیا کہ بادشاہ بیگم اس فوج کو فوراً برخاست کردیں۔ بادشاہ بیگم نے جواب دیا کہ وہ ایک غیر آباد مقام پر رہتی ہیں، اس لئے حفاظت کے لئے سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ بادشاہ نے اعلان کردیا کہ جو لوگ بادشاہ بیگم کی ملازمت قبول کریں گے وہ گرفتار کرلئے جائیں گے۔

چونکہ اتنے آوارہ منش افراد کا شہر کے قریب رہنا خطرہ سے خالی نہ تھا، اس لئے رزیڈنٹ کو بھی اس واقعہ کی اطلاع دیدی گئی اور شاہی فوج کا ایک دستہ قیام امن کے لئے الماس باغ بھیجدیا گیا۔ شاہی فوج نالہ کے اس طرف اور بیگم کی فوج، الماس باغ کے دوسری طرف تھی۔ گو رزیڈنٹ نے پہلے نجی معاملات میں مداخلت سے انکار کردیا تھا لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی۔ اس نے یہ محسوس کرکے کہ مبادا مستقبل قریب میں کوئی جھگڑا پیدا ہوجائے اُس نے مخبروں کو واقعات کی تصدیق کے لئے بھیجا اور خود بھی موقعہ کا معائنہ کرنے گیا۔ شاہی فوج کمزور بھی تھی اور غیر مسلح بھی، لیکن بیگم کی فوج زیادہ منظم اور تربیت یافتہ تھی، رزیڈنٹ نے یہ دیکھکر کہ اس ہنگامہ میں شہری آبادی کو زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے، خان بہادر سید التفات حسین امیر الانشا (چیف سکریٹری) کو بیگم کی خدمت میں کچھ ہدایات لیکر بھیجا۔ یہ الماس باغ گئے اور رزیڈنٹ کا پیام پہونچایا کہ گو نجی معاملات میں دخل دینا میں پسند نہیں کرتا

لیکن اب واقعات اس حد سے گزر گئے ہیں اور چونکہ معاہدات کی رو سے امن و امان کی ذمہ داری انگریزوں پر عاید ہوتی ہے، اس لئے میری رائے یہ ہے کہ آپ فوراً اس فوج کو علٰحدہ کر دیں۔ ایک معقول وظیفہ مختصر فوج کے لئے ماہوار آپ کو ملتا رہے گا اور شاہی فوج آپ کی حفاظت کرے گی، اگر آپ نے یہ صلاح نہ مانی تو مجبوراً انگریزی فوج آپ کی فوج کو ختم کر دے گی۔

بادشاہ بیگم، یہ پیام سُن کر بہت روئیں اور خان بہادر صاحب سے کہا کہ "مجھکو رزیڈنٹ کے احکام ماننے میں کوئی تامل نہیں ہے، میں تو خود چاہتی ہوں کہ رزیڈنٹ اس مسئلہ میں مداخلت کریں تاکہ میں اپنے دشمنوں کی شرارت سے محفوظ رہ سکوں، میں نے سلیماں جاہ (بادشاہ) کو جن مصائب سے پالا ہے اور انھوں نے چند خود غرض شریر النفس افراد کے کہنے سننے سے جو بدسلوکیاں میرے ساتھ روا رکھی ہیں وہ سب آپ کے علم میں ہیں، اب بھی کہ میں اس ویرانہ میں پڑی ہوئی ہوں، یہ لوگ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور روز ایک نئی خبر میرے خلاف بادشاہ کو کو بھیجتے رہتے ہیں۔ یقیناً مجھ کو اتنی فوج رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن حفاظت خود اختیاری کے خیال سے میں نے ایسا کیا تھا، اگر رزیڈنٹ میرا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیں اور شاہ زمن کی عطا کردہ جاگیر سلون مجھ کو واپس دلا دیں تو میں بیت الشرف (لکھنؤ) سے چلی جاؤں گی۔"

خان بہادر صاحب نے جواب دیا کہ "مجھ کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ میں کوئی پیام رزیڈنٹ کو پہونچاؤں لیکن اگر آپ رزیڈنٹ کو کوئی تحریر بھیج سکیں تو اُس کا جواب آپ کو ضرور ملیگا، گو میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن آپ یقین رکھیں کہ آپ کو ایک کثیر رقم بطور وظیفہ کے ملتی رہے گی تاکہ آپ محل میں اپنے نجی ملازمین رکھ سکیں۔"

بادشاہ بیگم نے جواب دیا "میں تو جاگیر چاہتی ہوں، علاوہ اس کے مجھے فوج کی تنخواہیں ادا کرنا ہیں، اگر مجھکو فی الحال ۳ لاکھ نقد دیدیا جائے تو میں ان لوگوں کی واجبات دیکر اُن کو برخاست کر دوں۔"

جب خان بہادر صاحب نے رزیڈنٹ کو تمام حالات سنائے تو رزیڈنٹ نے ان واقعات کی اطلاع بادشاہ کو بھی دیدی اور اس مسئلہ میں مداخلت کی اجازت چاہی، شاہی حکم سے اُسی وقت ایک لاکھ ادا کیا گیا اور ملازمین شاہی کو حکم دیا گیا کہ وہ بیگم کے ملازمین سے کوئی تعرض نہ کریں اور آیندہ شہر میں اُن کو بغیر کسی پابندی کے گھومنے کی اجازت ہے۔

اس سلسلہ میں بادشاہ بیگم کو ایک تحریر بھی بھیجی گئی کہ "اگر بادشاہ بیگم اپنی فوج کو برخاست کر دیں گی اور ۱۰۰ آدمیوں کی مختصر جماعت کو حفاظت کے لئے برقرار رکھیں گی تو ان لوگوں کی تنخواہیں خزانہ سے ماہ بہ ماہ ادا کی جایا کرے گی اور ایک لاکھ اس برخاست شدہ فوج کی تنخواہ کی ادائی کے لئے دیا جائے گا۔"

بادشاہ بیگم نے اسے منظور کر لیا، لیکن روپیہ لینے کے بعد پھر جاگیر کا مطالبہ کیا اور ۳ لاکھ مزید طلب کئے، لیکن رزیڈنٹ نے زیادہ رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا اور بادشاہ بیگم کو بھی خاموش ہو جانا پڑا

گو شاہی حکم کے بموجب بیگم نے فوج کو برخاست کر دیا تھا لیکن خفیہ طور پر ان لوگوں کو یہ ہدایت تھی کہ مکانوں پر رہیں اور اپنے کو بیگم کا ملازم تصور کریں، کچھ عرصہ کے بعد بادشاہ بیگم نے اپنے وکیل مرزا علی خاں کے ذریعہ سے دربار میں کہلوایا کہ جو رقم منظور کی گئی تھی وہ بہت کم تھی اس لئے مزید ایک لاکھ کے عطا کرنے کا حکم صادر کیا جائے۔

شام کو روپئے کی تھیلیوں پر سرکاری مہریں لگا دی گئیں لیکن دفعتاً رات کو نصیر الدین حیدر کا انتقال ہو گیا۔

(۶)

(نصیر الدین حیدر کی وفات، بادشاہ بیگم کا فریدوں بخت کو تخت نشین کرنے کی کوشش کرنا، کرنل جان لو کا فریدوں بخت اور بادشاہ بیگم کا حراست میں لینا اور نصیر الدولہ محمد علی شاہ نواب سعادت علی خاں کے بڑے صاحبزادہ کا تخت نشین ہونا)

۴ ربیع الثانی کو نصیر الدین حیدر کا انتقال ہوگیا۔ سلطنت کے سربرآوردہ افراد نے حسب دستور قدیم اس افسوسناک خبر کی اطلاع کرنل جان لو کمپنی کے نمایندہ کو مولوی یحییٰ علی خاں وکیل السلطنت کے ذریعہ سے دی۔ کرنل جان لو، ڈاکٹر اسٹیونس کے ساتھ محل پر پہونچے، ڈاکٹر نے نشتر دیا اور بادشاہ کی موت کا اعلان کر کے کیپٹن جیمس پٹین کو ایک فوجی دستہ کے ساتھ فرح بخش میں امن وامان قایم کرنے کے لئے متعین کیا اور کیپٹن فتح علی خاں، روشن الدولہ وغیرہ کے مشورہ سے کوٹھی کے صدر دروازہ اور دوسرے دروازوں پر بھی سنگین پہرہ بٹھا دیا۔ اس کے بعد بادشاہ بیگم کو پیام بھیجا کہ آپ کسی طرح بھی الماس باغ سے باہر نہ نکلیں، چونکہ بادشاہ نے اپنی حیات میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ فریدوں بخت اُن کے لڑکے نہیں ہیں۔ اس لئے نواب سعادت علی خاں کے لڑکوں میں نصیر الدولہ محمد علی خاں کی جانشینی کا فیصلہ ہوچکا تھا، اور وہی شاہ اودھ قرار دئے گئے۔

اس کے بعد بادشاہ بیگم کی طرف سے بعض حیرتناک اور غیر متوقع واقعات پیش آئے، بادشاہ بیگم گزشتہ ۳ سالوں سے ۸-۹ ہزار لوٹیرے دہقانیوں کو امام بخش بہشتی ساکن فتح گنج کے ذریعہ بھرتی کر رہی تھیں، یہ فریدوں بخت کو لیکر ۲۰۰ منتخب سواروں کے ساتھ امام بخش، موہن سنگھ اور لالتا پرشاد راجپوت کی قیادت میں شاہی محلات کی طرف چلا۔ یہ خبر رزیڈنٹ کو پہونچی، اسی کے ساتھ دوسری اطلاع یہ ملی کہ بادشاہ بیگم دریائے گومتی کے ساحل کی دوسری جانب شاہی محلات کے قریب پہونچ چکی ہیں۔ رزیڈنٹ نے خدا بخش چوبدار (جمعدار) کو بادشاہ بیگم کی خدمت میں دوبارہ بھیجا کہ آپ الماس باغ واپس تشریف لیجائیں۔ بادشاہ بیگم واپس جانے کے لئے طیار تھیں، لیکن مناجان اور امام بخش اُن کی راہ میں حایل ہوئے اور شاہی محلات میں داخل ہونے کی ترغیب دی اور کہا کہ ایسا وقت دوبارہ آنا ناممکن ہے، چنانچہ بادشاہ بیگم محلات تک پہونچ گئی تھیں۔ کیپٹن جیمس فرسٹ اسسٹنٹ مغربی پھاٹک پر موجود تھے اور کپتان فتح علی خاں کے مکان کی طرف دروازوں کے دونوں پٹ بالکل بند تھے۔ جب بادشاہ بیگم اور مناجان اُس جگہ پہونچے تو امام بخش، مناجان کے مشورہ سے دروازہ توڑنے کے لئے ایک ہتھنی لایا۔ اس ہنگامہ میں فرسٹ اسسٹنٹ کے ایک آدمی کو کسی نے مجروح کر دیا، اور لڑائی شروع ہوگئی۔

بادشاہ بیگم نے اندر جانے کے لئے دوسرے دروازہ پر بھی یہی ترکیب کی۔ جب فرسٹ اسسٹنٹ کے قتل کی بے بنیاد خبر اُڑی تو رزیڈنٹ نے خان بہادر سید التفات حسین کے ساتھ جاکر بادشاہ بیگم کو پھر یہی مشورہ دیا کہ وہ اس جھگڑے سے علٰحدہ ہوجائیں لیکن بادشاہ بیگم نہ مانیں، اس وقت باغیوں نے رزیڈنٹ، میر منشی اور فرسٹ اسسٹنٹ کو گھیر کر بارہ دری کا پھاٹک توڑ ڈالا اور اندر داخل ہوگئے، راجپوت سپاہیوں، امام بخش، موہن سنگھ اور لالتا پرشاد نے مناجان کو تخت پر بٹھلا دیا۔ اب تمام شاہی محلات باغیوں کے قبضہ میں تھے اور روشن الدولہ، نصیر الدولہ اور اُن کے اعزہ حراست میں تھے، باغیوں نے روشن الدولہ کو بھی مار ڈالنا چاہا تھا لیکن ان کے ملازم قادر بخش نے جان بچائی، اس وقت بہت سے امرائے سلطنت اپنی جان وآبرو کے خوف سے غائب ہوگئے، سبحان علی خاں نے بڑی مشکل سے جان بچائی۔ غلام یحییٰ خاں وکیل السلطنت نے شمالی دیوار سے کود کر

اپنی جان بچائی، اب دن ختم ہو رہا تھا، مرزا علی خاں وکیل، بادشاہ بیگم کی طرف سے رزیڈنٹ کے پاس گئے اور کہا کہ بادشاہ بیگم آپ کو سلام کہتی ہیں، رزیڈنٹ اُن کے ساتھ محل چلے گئے جہاں بادشاہ بیگم اُن کے استقبال کے لئے موجود تھیں، رزیڈنٹ نے واقعات و حالات بیان کر کے شکایت کی اور کہا کہ آپ الماس باغ تشریف لیجائیں، لیکن بادشاہ بیگم نے کچھ نہ سُنا۔ اس موقعہ پر بعض ناعاقبت اندیشوں نے رزیڈنٹ کو بھی قتل کرنے کی سعی کی لیکن وکیل نے ان کو ایسا کرنے سے باز رکھا، اس وقت ایک شخص نے گولی چلادی جو رزیڈنٹ کے کاندھے کے قریب سے نکل گئی۔ رزیڈنٹ واپس آگئے اور پھر بادشاہ بیگم سے کہلوایا کہ اب بھی یہی مناسب ہے کہ وہ تخت گاہ کو چھوڑ کر فوراً الماس باغ واپس چلی جائیں، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ رزیڈنٹ نے مصطفےٰ خاں کو دوبارہ طلب کیا اور کہا کہ اگر بادشاہ بیگم ۱۰ منٹ کے اندر میرے پاس نہیں آجائیں گی تو اُن کو اس کے لئے بھی طیار رہنا چاہئے کہ وہ توپوں کی باڑھ سے اُڑا دی جائیں۔ بادشاہ بیگم نے اطاعت کا وعدہ کر لیا لیکن اُن کے ملازمین آمادۂ پیکار تھے اور وہ اپنے وعدہ پر قایم نہ رہ سکیں، اب رزیڈنٹ کے پاس کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا انھوں نے کمرہ کے سامنے بندوقوں کی باڑھ چھوڑنے کا حکم دیا، لیکن یہ حکم دیدیا کہ جو اس ہنگامہ سے بھاگ کر علٰحدہ ہو جائے اُس سے تعرض نہ کیا جائے۔ انگریز سپاہی سیڑھیوں سے بارہ دری میں داخل ہوگئے خوش قسمتی سے چند منٹ قبل بادشاہ بیگم پالکی میں بیٹھکر بارہ دری کے متصل مکان میں چلی گئی تھیں جہاں بادشاہ کی نعش رکھی تھی۔ مصطفےٰ خاں جلدی سے مناجان کو دوسرے کمرہ میں لے گیا۔ جب بندوقیں چلیں تو بیگم کے ۶۰ آدمی جن میں مصطفےٰ خاں رسالدار موہن سنگھ، لالتا پرشاد اور دولت دلدور اگویا (جو مبارک بادگا رہا تھا) مارے گئے۔ اس ہنگامہ میں دو انگریز سپاہی بھی زخمی ہوئے اور ایک جان سے مارا گیا۔ بادشاہ بیگم اس ہولناک منظر کو دیکھ کر تاب نہ لاسکیں اور بے پردہ پالکی سے باہر آگئیں۔ اس فتح کے بعد انگریز سپاہی بارہ دری میں داخل ہوئے اور بادشاہ بیگم کو پالکی میں بٹھا کر اور مناجان کو ہتکڑیاں ڈالکر پاپیادہ رزیڈنسی میں پہونچا دیا۔ اس کے بعد نواب نصیر الدولہ کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ اور وہ شاہی ساز و سامان کے ساتھ فرح بخش تشریف لے گئے اس کے بعد بادشاہ نے منو خاں گورکن کو قدسیہ بیگم کے مقبرہ کے پاس دریا کی دوسرے جانب مقبرہ بنانے اور قبر کھودنے کا حکم دیا اور مرزا علی خاں کوتوال شہر کو حکم دیا گیا کہ شہر میں منادی کر دی جائے کہ لوگ اپنی دوکانیں کھولیں۔ اور یہ فرمان شایع کیا گیا:

"۱۴ ربیع الثانی کی درمیانی شب کو یکشنبہ کے دن قطب الدین ابوالمظفر سلیماں جاہ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کا انتقال ہوگیا مشیت ایزدی اور قانون وراثت کے موجب اور کمپنی بہادر کی امداد سے ہز مجسٹی محمد علی شاہ اُن کے جانشین اور بادشاہ اودھ ہوئے، عام لوگ اپنے انتظامی فرایض ہوشیاری دیانتداری اور فراست سے انجام دیتے رہیں اور روشن الدولہ بہادر کے ذریعہ سے احکام کی پابندی کرتے رہیں"۔

اسی دن سہ پہر کو مرحوم بادشاہ کو محذرۂ علیا کے مقبرہ کے قریب غسل دیا گیا اور شاہی ساز و سامان کے ساتھ جنازہ اُٹھایا گیا۔ تمام امرا اور خاندان کے معزز افراد جنازہ کے ہمراہ تھے۔ ڈاکٹر اسٹیونس اور رزیڈنٹ بھی جلوس جنازہ میں شریک تھے۔

تقریباً ۲ ہزار روپیہ خیرات کیا گیا اور نماز جنازہ کے بعد قدسیہ بیگم کے مقبرہ کے قریب نو تعمیر کربلا میں مرحوم بادشاہ کی نعش کو سپرد خاک کیا گیا۔

اب بادشاہ بیگم اور مناجان دونوں زرد کوٹھی میں مقید تھے۔ مناجان نے پہلے دو دن تو تنہا بسر کئے، لیکن بعدہ اُن کی دردناک آہ و بکا نے رزیڈنٹ کو متاثر کیا اور اُنھوں نے اُن کو بادشاہ بیگم کے ساتھ رہنے کی اجازت عطا کر دی۔ اُن کے پاس

سوائے ایک پرانی چٹائی اور ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی کے کوئی سامان نہ تھا۔ ایک بھشتی کا لڑکا جس کا نام مرزا علی تھا ان بدنصیب قیدیوں کا کھانا لاتا تھا۔ اس کے بعد ۸ ربیع الثانی کو نصف شب کے وقت بادشاہ بیگم اور مناجان دونوں کو جنرل اسٹیونس کی حراست میں کانپور بھیج دیا۔

جب ہنگامہ فرو ہوگیا تو رزیڈنٹ نے ایک مکمل اطلاع اس ہنگامہ کی صدر دفتر کلکتہ بھیجی چونکہ رزیڈنٹ نے اس موقع پر سب کچھ ٹھیک کیا تھا اس لئے وہاں سے بھی مہر تصدیق ثبت ہوگئی اور رزیڈنٹ کی تحسین و توصیف بھی ہوئی، ۲۱ ربیع الثانی کو بہ زبان انگریزی بادشاہ کی اورنگ نشینی کی منظوری آگئی اور جو انتظامات رزیڈنٹ نے اس موقع پر کئے تھے اُن کی بھی تعریف کی گئی۔ پھر رزیڈنٹ نے کلکتہ کے احکام کے موجب ۱۸ کنیزیں اور مناجان کی ماں افضل محل کو بھی کانپور روانہ کردیا کمپنی کا حکم تھا کہ بادشاہ بیگم اور مناجان کو چنار کے قلعہ میں بنارس سے ۶ میل کے فاصلہ پر بھیجا جائے۔ اس لئے ۴ رجب کو اُسی سال جب تمام اشیا لکھنؤ سے آگئیں تو بادشاہ بیگم اور مناجان تلنگوں کی دو کمپنیوں کی محافظت میں ایک انگریز رسالہ کے ساتھ چنار گڑھ بھیجدئے گئے اور دو ہزار چار سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا۔

مشیر احمد علوی

ہندوستان کے دیہات سے عبارت ہے، دیہاتیوں کی زندگی کے آثار چڑھاؤ کے نقوش نوجوان جذباتی شاعر اور فسانہ نگار

احمد ندیم قاسمی کی مشہور تصنیف

دارالاشاعت پنجاب لاہور سے کا پتہ

دارالاشاعت پنجاب لاہور سے کا پتہ

چوپال

میں دیکھئے، یہ چودہ افسانوں کا مجموعہ ادب اُردو میں بالکل نئی چیز ہے اور ایک ایسی ضرورت کو پورا کر رہا ہے جو ایک مدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ مقتدر اخباروں اور رسایل نے اس کتاب پر بہت اچھے تبصرے لکھے ہیں:

روزنامہ انقلاب لاہور: احمد ندیم کی شاعری اور افسانہ نگاری اُردو میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ جن چیزوں نے منشی پریم چند کو اُردو کا بہترین افسانہ نگار بنایا وہ ہمارے احمد ندیم میں ابھی سے بدرجۂ اتم موجود ہیں یعنی صحیح مشاہدہ صحیح احساس دیہاتی زندگی سے تعلق اور سلاست زبان۔

ہمایوں: احمد ندیم صاحب نے اپنے افسانوں کے لئے دیہات کی فضا منتخب کی ہے۔ اُن کے ہیرو عموماً سادہ لوح دیہاتی لڑکے اور لڑکیاں ہوتی ہیں۔ انھیں کی محبت، دوستی اور دشمنی ان کے افسانوں کا موضوع ہوتا ہے۔ احمد ندیم صاحب کی زبان صاف ستھری اور سلیس ہے اور فنی نقطۂ نظر سے اُن کے افسانے قابل قدر ہیں۔

ساقی: چوپال اُردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔

ادبی دُنیا: انھوں نے دیہاتی زندگی اور اُس کے مسایل کا مطالعہ نظرِ غائر سے کیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب وہ ایک خاص طرز کے کامیاب افسانہ نگار کہلائیں گے۔

مُصوّر بمبئی: اچھوتے افکار اور فلک رس بلندی ہر اُس لفظ سے مترشح ہوتی ہے جو ندیم کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر آجاتا ہے۔

خیام: احمد ندیم قاسمی ایک رنگین نوا شاعر ہونے کے علاوہ درجہ اول کے صاحب طرز انشا پرداز بھی ہیں۔ آپ کے افسانوں کو جو حیرت انگیز ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ محتاج تصریح نہیں۔ اُردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اُنکے چودہ طبعزاد افسانوں کا ایک حسین و جمیل مجموعہ چوپال مطلع اشاعت پر جلوہ گر ہوا ہے۔

کتابت دیدہ زیب۔ چھپائی عمدہ۔ کاغذ نفیس۔ فی جلد قیمت ۸/-

وقت کا اہم ترین مسئلہ

اس سے قبل کی اشاعت میں ہم نے اس موضوع پر لوگوں کو اظہار خیال کی دعوت دی تھی، چنانچہ اس اشاعت میں ہم محمد عتیق صاحب صدیقی کا مقالہ اس موضوع پر شایع کرتے ہیں

دُنیا کی موجودہ سیاسی کشمکش، اس کی شکل چاہے جیسی کچھ ہو، اگر ہم اس کا تجزیہ کریں گے، تو صرف اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ اسکی بنیاد دراصل قومی دولت اور ذرایع آمدنی کی غیر مساوی تقسیم ہے۔ چنانچہ ہندوستان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں اور ہمارے تمام مسایل چاہے وہ سیاسی ہوں یا سماجی، دولت کی اس غیر مساوی تقسیم اور ذرایع آمدنی کے عدم توازن کی وجہ سے اُلجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

قومی دولت، اور ذرایع آمدنی کی مساوی تقسیم کا مسئلہ آج پہلی بار دنیا کے سامنے نہیں آیا ہے، بلکہ ہر دور میں کسی نہ کسی طرح اِس دشواری پر انسان کو قابو حاصل کرنا پڑا ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا، جب دنیا 'اقتصادیات' کی پرشوکت اصطلاحوں سے آشنا نہ تھی، اور دولت کی مساوی تقسیم نے علمی رنگ اختیار نہ کیا تھا۔

اُس زمانہ میں یہ دستور وضع کرلیا گیا تھا کہ تھوڑے عرصہ کے بعد قومی دولت از سرِ نو آپس میں بانٹ لی جائے۔ مثلاً قانون موسوی یہ تھا کہ ہر پچاس سال کے بعد قومی دولت از سرِ نو برابر بانٹ لی جائے۔ اس کو وہ "ذرایع آمدنی کی نئی تقسیم" سے بھی تعبیر کرتے تھے۔ ہندوستان میں بھی تقریباً یہی ہوتا تھا۔

یہ قیاس آرائی نہیں، بلکہ اس کے تاریخی شواہد موجود ہیں۔ ہندوستان کا طرز تقسیم موسوی قانون سے ذرا مختلف تھا یہاں ملک دیہی حلقوں میں تقسیم تھا اور ہر حلقہ کے افراد ایک مقررہ وقت کے بعد دولت آپس میں تقسیم کرلیتے۔ آج ممکن ہے کہ یہ بہت بڑی بات معلوم ہو مگر اُس وقت تو یہ زندگی کا معمولی کاروبار تھا۔ گویا ماہرین اقتصادیات کی وساطت کے بغیر، خود اُنکے شعور نے یہ راز سمجھا دیا تھا کہ قومی فلاح و بہبودی کا انحصار ذرایع آمدنی کی مساوی تقسیم پر ہے۔ شاید اُس زمانہ تک ہمارے ملک کی سرشت میں وہ چیز داخل نہ ہوئی تھی جسے آج ہم 'بنیاپن' کہتے ہیں۔

غرض آج ہمارے افلاس اور ہماری سیاسی بےچینی کا جو سبب بتلایا جاتا ہے وہ مرض کی کوئی نئی تشخیص نہیں ہے۔ اگلے زمانہ میں بھی لوگ اس سے واقف تھے لیکن فرق صرف یہ تھا کہ وہ اس مرض کے آثار پیدا ہوتے ہی اُس کا مداوا کر ڈالتے تھے اور ہم ایسا نہیں کرتے۔

اس وقت حالت یہ ہے کہ ایک طرف تو ملک کی ساری دولت چند افراد کی تجوریوں میں مقفل ہے، جس سے کوئی کام

نہیں لیا جاتا اور دوسری طرف ملک کی تقریباً ۹۹ فیصدی آبادی افلاس و ناداری کا شکار ہو رہی ہے۔ جن لوگوں کے پاس دولت ہے یہ خزانے مدفون ہیں وہ بھی اپنی دولت میں اضافہ کرنے کی فکر کرتے رہتے ہیں، لیکن اس کا صرف ایک طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، یعنی جمع شدہ دولت کو ہاتھ لگائے بغیر جہاں تک ہو سکے دُنیا کو لوٹا جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت کی گردش جو قومی دولت کے اضافہ کا واحد طریقہ ہے اُس کا وجود سرے سے مفقود ہو جاتا ہے

قومی زندگی میں دولت کی گردش کو وہی درجہ حاصل ہے جو انسان کے بدن میں خون کی گردش کو، یعنی جس وقت تک ہمارے جسم میں خون کی گردش جاری ہے ہم زندہ ہیں اور جونہی یہ گردش ختم ہوئی فوراً ہمارا جسم سرد ہو گیا۔

اسی طرح قومی دولت میں اضافہ کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ قومی دولت کا اُلٹ پھیر ہر وقت جاری رہے اور وہ کسی جگہ رکنے نہ پائے اور اگر ایسا نہ ہوا تو قومی دولت گھٹ جائے گی۔

ہمارے سامنے اس اُصول کی کامیابی کی روشن مثال ریاستہائے متحدہ امریکہ ہے۔ وہاں اگر کسی فرد کے پاس ایک لاکھ ڈالر کی رقم ہو گی تو وہ اُس رقم کو تجوری میں بند نہ کرے گا بلکہ کسی تجارت میں لگائے گا۔ اس کے فایدے دو ہیں ایک یہ کہ اُس کو برابر نفع ملتا رہیگا جس سے خود اُس کی دولت میں اضافہ ہو گا اور دوسری طرف اُس سے قومی بیروزگاری بھی جاتی رہے گی۔ بیر چند اس تجارت سے جو نفع اُس کو ہوتا ہے اُس کا معتد بہ حصہ وہ اپنی آسایش و تفریح پر صرف کرتا ہے، تاہم قوم کے افراد اور ملک کی صنعت و حرفت کو بھی اس سے فایدہ پہونچتا رہتا ہے۔

ہمارے بدنصیب ملک میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کے پاس دولت جمع ہو گئی تو وہ اُس کو تجارت میں نہ لگائے گا بلکہ اُسکا سونا خرید کر بیوی کا زیور بنوا دے گا یا پھر داشتہ آید بکار پر عمل کر کے زمین میں دفن کر دے گا، اسی کے ساتھ یہ بھی کرتا ہے کہ اپنی آمدنی کا کم سے کم حصہ اپنی ضروریات پر صرف کرتا ہے، جس سے قومی دولت کی گردش رفتہ رفتہ گم ہوتی جاتی ہے۔

آج دنیا کے بیشتر ممالک میں جو سیاسی ہلچل مچی ہوئی ہے اُس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہاں کی قومی دولت صرف چند ہاتھوں میں ہے اور اُن ملکوں کی اقتصادی حالت اُس نے ناگفتہ بہ بنا دی ہے۔ جو قومیں آج ہوش و گوش سے کام کر رہی ہیں وہ اپنی تنظیم محنت کی اندرونی تقسیم کی بنیادوں پر کرتی ہیں جس سے اشیاء اور محنت دونوں کا پورا پورا مبادلہ عمل میں آتا ہے۔

ایک یونیورسٹی کے ماہر اقتصادیات کا اندازہ ہے کہ ہندوستان کے پاس اتنی دولت موجود ہے کہ ۸۰ کروڑ افراد کی زندگی عیش و مسرت کے ساتھ بسر ہو سکتی ہے۔ اگر یہ بیان صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں، تو یہ حقیقت حد درجہ اندوہناک ہے کہ وہ ملک جس کی مادر وطن اپنے ۸۰ کروڑ بچوں کی پرورش اطمینان کے ساتھ کر سکتی ہو، وہی ملک اپنے ۴۰ کروڑ افراد کو ایک وقت بھی آدھا پیٹ کھانا دینے سے قاصر ہو۔ یہ کرشمہ ہے دولت کے جمود اور ذرایع آمدنی کی غیر سمادی تقسیم کا۔

ماہرین اقتصادیات ہندوستانی افلاس کے مختلف اسباب بتلاتے ہیں اور مختلف علاج تجویز کرتے ہیں مثلاً ایک گروہ کا خیال ہے کہ ہمارے افلاس کا اصل سبب ملک کی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہے۔ پروفیسر آدکار، ہندوستان کے اقتصادی ماہر کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے ایسے اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جن سے ہم کو یہ اندازہ ہو سکے کہ ملک کی آبادی میں جو اضافہ ہوتا ہے اُس کے ساتھ ملک کی دولت میں بھی اضافہ ہوتا ہے یا نہیں۔ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ کسی ملک کی اقتصادی

خوش حالی کا تمام تر انحصار اُس ملک کی سیاسی آزادی پر ہے

بہرحال اس امر پر ماہرین اقتصادیات متفق ہیں کہ ہماری قومی دولت کی از سرِ نو مساوی تقسیم ضروری ہے۔ یہ تقسیم کس طرح عمل میں آئے؟ اس کا جواب ایک سے زیادہ شکلوں میں دیا جاتا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پہلے آبادی کے اضافہ کو روک دیا جائے اور ضبط تولید کے اُصول کو ملک میں رواج دیا جائے کچھ لوگ ملک کی صنعتی ترقی پر زور دیتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو ہم کو ماضی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قدیم ہندوستان کے اُصول کو از سرِ نو عمل میں لایا جائے، یعنے ملک کو چھوٹے چھوٹے دیہی حلقوں میں تقسیم کرکے منظم کیا جائے۔

ابتدا ہی میں اس کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اگر کسی ملک میں دولت کی گردش اور ذرایع آمدنی کے توازن کا فقدان ہو جائیگا تو اُس کا فوری نتیجہ اشیاء اور محنت کے فقدان کی شکل میں نمودار نہ ہوگا۔ لیکن اُس کے نتائج اس سے بھی زیادہ دور رس ہوں گے۔ زیادہ واضح الفاظ میں اس کو یوں بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ قومی دولت کی تقسیم میں جوں جوں فرق آتا جائے گا، جوں جوں دولت ایک جگہ ڈھیر ہوتی جائے گی، اُسی مناسبت سے ملک میں ضروریات زندگی کی اشیاء کی پیداوار میں بھی کمی آتی جائیگی۔ یہاں ایک لکھپتی ہے جس کی آمدنی ایک لاکھ روپیہ سالانہ ہے، دوسری طرف ایک مزدور ہے جس کی روزانہ آمدنی چند آنے سے زیادہ نہیں۔ لیکن وہ لکھپتی اپنی دولت کے لحاظ سے اتنی زیادہ چیزیں نہیں خرید سکتا جتنی مزدور کو خریدنی پڑتی ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اگر کسی ملک میں سوا ایسے افراد ہوں تو وہ ایک لاکھ مزدوروں اور کسانوں کی قوت خریداری کا بدل نہیں ہو سکتے۔ غرض صورت حال یہ ہوتی ہے کہ عین اُسوقت جب ایک مزدور یا کسان اپنے اندر خریداری کی اہلیت نہیں رکھتا ہے، ایک سرمایہ دار خریدنا نہیں چاہتا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اشیاء کی پیداوار میں کمی شروع ہو جاتی ہے اور بیکاری بڑھنے لگتی ہے۔ کیونکہ کارخانے تو اسی قدر سامان طیار کریں گے جس قدر کھپ سکے گا اور کھپت کی کمی کے ساتھ ساتھ کارخانہ دار مزدوروں کی تعداد میں بھی کمی شروع کریں گے۔ غرض اس سے ایک طرف قومی دولت انحطاط پذیر ہونے لگتی ہے اور دوسری طرف افلاس و بیکاری کے ساتھ سیاسی بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔

ہر ملک کی صنعتی ترقی اور تنزل کا انحصار بڑی حد تک باشندگان ملک کی ضروریات زندگی کی بیشی و کمی اور اُن کے معیار حیات کی بلندی و پستی پر ہوا کرتا ہے۔ یعنی اگر کسی ملک کے بسنے والوں کا معیار حیات بلند ہے تو وہ ملک یقیناً صنعتی حیثیت سے ترقی کرے گا۔ اور معیار حیات کی بلندی منحصر ہے صرف قومی دولت کی گردش پر۔ اس کو یوں سمجھئے کہ جس ملک میں دولت کی گردش منقطع ہوگی وہاں کے باشندے مفلس ہوں گے اور ان میں خریداری کی اہلیت ہی نہ ہوگی۔ بدقسمتی سے آج تک ہمارے مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کا معیار بلند کرنے کی آج تک کسی نے کوئی کوشش ہی نہیں کی۔ چنانچہ ہمارے برادران وطن کی ضروریات زندگی اس درجہ کم ہیں کہ آپ ان کو بہ آسانی انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔

ماہرین اقتصادیات اس جگہ پر بھی آپس میں متفق نہیں ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ لوگوں کا معیار حیات بلند کرنے اور خریداروں کی فہرست میں اضافہ کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ مزدوری میں کمی کئے بغیر اشیاء کی قیمتیں کم کر دی جائیں دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اشیاء کی قیمتوں میں کمی کرنے کے بجائے مزدوروں میں اضافہ کیا جائے۔ لیکن اس بات پر سب

متفق ہیں کہ دولت کی از سرِ نو تقسیم عمل میں آئے، خواہ اُس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ قومی دولت کی ترقی کا واحد ذریعہ یہی ہے۔

ملک کی صنعتی ترقی اور قوم کی اقتصادی خوش حالی کے بالعموم دو ہی ذریعے ہوا کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ملک کے تمام صنعتی ادارے حکومت کی ملکیت ہوں اور حکومت کو ان پر پورا اقتدار حاصل ہو اور ان صنعتی اداروں میں جو کچھ پیدا ہو اُس کی تقسیم کی ذمہ داری بھی حکومت ہی انجام دے۔ یعنی پیداوار اور اُس کی کھپت کی ذمہ دار حکومت ہی ہو۔ ایسے نظامِ حکومت میں فرد کی کوئی حیثیت اور حقیقت نہیں ہوتی بلکہ اُس کی ذات جماعت میں گم ہو جاتی ہے۔ فرد جو کچھ کرتا ہے وہ اپنے لئے نہیں کرتا بلکہ پوری جماعت کی بہبودی کے لئے کرتا ہے، اس نظام میں خود غرضی کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ لیکن یہ خرابی ضرور ہوتی ہے کہ انسان کی انفرادی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔ حکومت نے ہاتھ اُٹھا کر جو کچھ اُس کو دیدیا اُس پر وہ قانع ہونے کے لئے مجبور ہے۔ یہ ہے اشتراکی نظامِ حکومت کا نظریہ۔

ملک کی صنعتی و اقتصادی ترقی کا دوسرا نظریہ ہم کو سرمایہ دارانہ نظام میں نظر آتا ہے۔ اس نظام میں چند افراد ذرائع پیداوار پر اقتدار حاصل کر لیتے ہیں اور اپنی خواہش کے مطابق صنعت کو ترقی دیتے ہیں۔ اس نظام میں باشندگانِ ملک کی فلاح و بہبودی کا نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس نظام میں دولت کی گردش تو یقیناً جاری رہتی ہے مگر عدمِ توازن کے ساتھ، مزدوروں اور کسانوں کے معیارِ حیات کو بلند کرنے کی طرف بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی، کیونکہ وہ لوگ خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ مزدوروں کا معیارِ حیات بلند ہوا تو وہ مزدوری میں اضافہ اور اشیاء کی قیمت میں کمی کا مطالبہ کریں گے جس سے خود اُن کے منافع میں کمی ہونا یقینی ہے۔

متذکرۂ بالا ہر دو نظام کے بین بین صرف ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ لوگوں کو نجی طور پر کاروبار کرنے کی اجازت تو ہو مگر بڑی بڑی صنعتوں پر حکومت کو اقتدار حاصل ہو جو باشندگانِ ملک کی صحیح ضروریات کے مطابق اور ان کی فلاح و بہبودی کے پیشِ نظر ان صنعتوں کو ترقی دے۔ نیز ہر فرد کو اُن صنعتوں سے فایدہ اُٹھانے کا پورا موقعہ دیا جائے۔

آج ہندوستان کو بھی سب سے زیادہ ایسی چیز کی ضرورت ہے کہ ایک طرف ہمارے مزدوروں اور کسانوں کا معیارِ حیات بلند ہو اور دوسری طرف بڑی صنعتوں پر حکومت کو قابو حاصل ہو اور قومی ذرائع آمدنی لوگوں میں مساوی طور پر تقسیم ہوں۔

(ماخوذ) محمد عتیق صدیقی

تذکرۂ معرکۂ سخن

اپنے رنگ کا بالکل پہلا تذکرہ، جس میں بتایا گیا ہے کہ بڑے بڑے اساتذہ کے کلام پر کیا کیا اعتراض کئے گئے اور یہ کہ ان کا کوئی جواب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ تذکرہ انتہائی کاوش کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور فنِ شعر کے متعلق بے بہا معلومات کا ذخیرہ ہے۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ آٹھ آنہ (ع)

مینیجر نگار لکھنؤ

پاسِ عہد

(انقلاب حکومت عثمانی کا ایک تاریخی رومان)

قاہرہ کے ایک نہایت آباد محلہ میں ایک نہایت غیر آباد گھر بھی تھا۔ اس مکان کی وحشت و ویرانی کے متعلق عجیب عجیب روایتیں مشہور تھیں، محلہ کی بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ یہاں راتوں کو جنات آتے ہیں اور جب سارا شہر سو جاتا ہے تو یہ اس مکان میں ہنگامہ مچاتے پھرتے ہیں

یہ مکان کسی وقت بڑا محل رہا ہوگا لیکن اب بالکل کھنڈر تھا اور اُس کی دیواریں اور اونچی اونچی چھتیں، چمگادڑوں اور ابابیلوں کا مسکن تھیں، جن کی چیخ اور پھڑپھڑاہٹ سے رات کے سناٹے میں یہ مکان اور زیادہ بھیانک ہو جاتا تھا۔ لیکن اہلِ محلہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ایک شام انھوں نے دیکھا کہ ایک نامعلوم شخص اس مکان میں آگیا ہے

یہ ایک نہایت ضعیف شخص تھا۔ کمر ٹیڑھی، بینائی کمزور اور صورت مکروہ۔ شام کو یہ مکان کے اندر داخل ہوا اس حال میں کہ ایک ہاتھ سے وہ لکڑی کا سہارا لیتا جاتا تھا اور دوسرا ہاتھ ایک حبشی کے ہاتھ میں تھا۔ لوگوں نے اُسے حیرت سے دیکھا اور اسے جادوگر سمجھ کر خاموش ہو رہے۔ یہ شخص صرف جمعہ کے دن نماز پڑھنے باہر نکلتا تھا اور پھر ایک ہفتہ کے لئے اندر بند ہو جاتا تھا لوگ اسے آتے جاتے دیکھتے تھے، لیکن پاس نہ جاتے تھے اور بالکل الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے

اسی کھنڈر کے پاس ایک عظیم الشان محل تھا جس کے مالک کا نام لطیف پاشا تھا یہ معہ اپنی بیوی سیدہ نادر، اور بیٹی فاطمہ کے یہاں رہتا تھا، فاطمہ کی عمر اُنیس سال کی تھی اور بہت کمسنی میں اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ لطیف پاشا نے اس کے بعد کئی شادیاں کیں اور ساری دولت عیش رانیوں میں کھو دی۔ اس وقت اس کی عمر ۵۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی لیکن اسکی بیوی سیدہ نادر ابھی تک جوانی کے حدود سے باہر نہ نکلی تھی اور جو کچھ لطیف پاشا کے پاس باقی رہ گیا تھا وہ اس کی زیبائش و آرائش میں صرف ہو رہا تھا

فاطمہ کے سر سے چونکہ ماں کا سایہ بہت کمسنی میں اُٹھ گیا تھا، اور لطیف پاشا اپنی رنگ رلیوں میں بیٹی کی زیادہ پروا نہ کرتا تھا اس لئے اس کا نشو و نما اچھی طرح نہ ہو سکا اور اس کے چہرہ پر ایک مستقل کیفیت سوگ کی سی قایم ہو گئی۔ اس کی عمر ۱۹ سال کی ہو چکی تھی، لیکن سوائے قدرتی خد و خال کی خوبصورتی کے، ولولۂ شباب سے پیدا ہونے والے حسن و جمال کی جھلک اس میں بہت کم پائی جاتی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں، کھلی ہوئی پیشانی اور صحیح کتابی چہرہ سے ذہانت تو ضرور ظاہر ہوتی تھی، لیکن جوانی کی

مسرتوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ ہر وقت کسی فکر میں مبتلا نظر آتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہلکے قسم کے مقناطیسی خواب میں مصروف ہے

وہ اپنے باپ کی نہایت اطاعت مند اور اپنی سوتیلی ماں کی نہایت خاموش بیٹی تھی اور اس نے کبھی اس بات کا موقعہ نہیں دیا کہ سیدہ نادر لطیف پاشا سے کوئی شکایت اس کی کر سکے۔ قرض پر قرض بڑھ رہا تھا اور لطیف پاشا کی ایک ایک چیز سیدہ نادر کی آسایش و زیبایش پر قربان ہوتی جاتی تھی، یہاں تک کہ مکان بھی رہن ہوگیا اور رفتہ رفتہ وہ وقت آگیا کہ مکان نیلام ہوگیا اور لطیف پاشا کو اس کے خالی کرنے کا نوٹس ملگیا

یقیناً لطیف پاشا اور سیدہ نادر کے لئے یہ بڑا سخت وقت تھا، کیونکہ اب سر چھپانے کی جگہ بھی اُن سے چھینی جا رہی تھی اور دنیا میں کہیں اُن کو دوسرا ٹھکانا نظر نہ آتا تھا۔ فاطمہ کی دردمندیاں ان سے زیادہ تھیں، کیونکہ اب ایک طرف تو وہ اپنے باپ کی مصیبتوں کا خیال کر کر کے پریشان ہو رہی تھی اور دوسری طرف وہ اس مکان سے جدا ہو رہی تھی، جہاں اس کی مری ہوئی ماں کی بہت سی یادگاریں اس کا دل بہلایا کرتی تھیں

نوٹس ملنے کے دوسرے دن صبح کو لطیف پاشا نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ گھر سے نکلنے کی طیاریوں میں مصروف تھا کہ اُسی کھنڈر والے پڑوسی کا حبشی خادم آیا اور کہا کہ میرے مالک نے ایک خاص پیغام دیکر بھیجا ہے

لطیف پاشا نے پوچھا "تمھارا مالک کون ہے۔ اس نے جواب دیا کہ "میں آپ کے نئے پڑوسی مختار آفندی کا خادم ہوں اور میرا نام سعید ہے"

لطیف پاشا نے کہا کہ "میں نہیں سمجھ سکتا کہ تمھارا مالک جو خود ساری دنیا سے الگ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے ایک ایسے شخص کے پاس کیا پیام بھیج سکتا ہے جو خود گھنٹہ دو گھنٹے کا مہمان ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اُس کی آیندہ زندگی تمھارے مالک کی جائے قیام سے کتنی دور کس طرح بسر ہوگی"

سعید: "یہ درست ہے، لیکن میرے آقا نے اسی مکان کے متعلق ایک پیام لیکر بھیجا ہے"

لطیف پاشا: "میں سمجھ گیا، یہ مکان غالباً اسی نے خریدا ہے اور تم یہ کہنے آئے ہوگے کہ میں جلد سے جلد اسے خالی کر دوں، تو، تم اپنے مالک سے جا کر کہدو کہ ہم مکان چھوڑ رہے ہیں اور شام کو وہ آزادی کے ساتھ یہاں آسکتا ہے"

سعید: "نہیں، میں یہ کہنے نہیں آیا، بلکہ یہ پیام لیکر آیا ہوں کہ آپ بدستور اس مکان میں قیام رکھیں اور کسی اور جگہ منتقل ہونے کی زحمت گوارا نہ کریں"

لطیف پاشا یہ سنکر حیران رہگیا اور بولا کہ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو، میں بالکل نہیں سمجھا"

سعید: "میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ واقعی یہ مکان میرے آقا نے خرید لیا ہے، لیکن وہ نہیں چاہتا کہ آپ یہاں سے جائیں، بلکہ وہ پانچ ہزار گنی کا ہدیہ بھی آپ کی ضرورتوں کے لئے پیش کرنا چاہتا ہے"

لطیف پاشا: "کیا تو پاگل ہوگیا ہے، جو ایسی باتیں کرتا ہے"

سعید: "نہیں میں پاگل نہیں ہوں، بلکہ ایک واقعی معاملہ کی صورت سے یہ پیغام لیکر آیا ہوں"

لطیف پاشا: "معاملہ ؟ ، معاملہ کیسا ؟"

سعید: "وہ یہ کہ میرا آقا، اس کے عوض میں آپ کی بیٹی فاطمہ کو پیغام نکاح دینا چاہتا ہے"

یہ سنکر لطیف پاشا زور سے ہنسا اور بولا کہ "کیا تیرا آقا دیوانہ ہے، کیا اسے یقین ہے کہ میں ایک بدصورت بڈھے سے اپنی بیٹی کو بیاہ دوں گا۔ مجھے فقر و فاقہ کی مصیبتیں گوارا ہو سکتی ہیں، لیکن یہ رشتہ گوارا نہیں"

سعید نے کہا کہ "آپ پھر اس پر غور فرمایئے"۔ یہ سنکر پاشا چلا اُٹھا اور نہایت سخت و ست الفاظ منہ سے نکالنے لگا

اس شور کو سنکر سیدہ نادر اور فاطمہ بھی وہاں پہونچ گئیں اور پاشا نے سارا حال انھیں سنایا۔ سیدہ نادر دل سے تو چاہتی تھی کہ یہ رشتہ ہو جائے تو اچھا ہے، کیونکہ اس طرح فاطمہ بھی گھر سے چلی جائے گی اور اس کی عیش رانیوں کے لئے کافی دولت ہاتھ آئیگی لیکن کچھ بولی نہیں ۔ فاطمہ البتہ اُٹھی اور اپنے باپ سے کہا کہ "آپ اس پیام کو قبول کر لیجئے، کیونکہ میں آپ کی تکلیف و مصیبت کو نہیں دیکھ سکتی ۔ میری ایک ذات کی قربانی کوئی حقیقت نہیں رکھتی اگر اس سے کسی خاندان کی تباہیاں دور ہو سکتی ہیں"

یہ سنکر لطیف پاشا نے بہت کوشش کی کہ فاطمہ کو اس ارادہ سے باز رکھے، لیکن وہ کامیاب نہ ہوا اور آخرکار دوسرے ہی دن فاطمہ کی شادی ہو گئی

فاطمہ جب اپنے شوہر کے گھر میں داخل ہوئی تو اس کا دل دھڑک رہا تھا، وہ اس کھنڈر کے عفریت پر اپنی قربانی چڑھا چکی تھی، اور ڈر رہی تھی کہ معلوم نہیں وہ عفریت اسے کیا کیا اذیتیں پہونچائے

جب فاطمہ یہاں پہونچی تو اس کے شوہر مختار آفندی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھنڈر کی سیر کرانے لے چلا۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہاں کثافت کا ڈھیر ہوگا، چمگادڑوں اور ابابیلوں نے ہر طرف گندگی پھیلا رکھی ہوگی اور ہر طرف عفونت ہی عفونت نظر آئے گی، لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ مکان جو باہر سے اس قدر ویران نظر آتا ہے، اندر سے ایک آراستہ محل بنا ہوا ہے۔ اس کے متعدد کمرے، متعدد برآمدے، شہ نشین، حُجرے، انتہائی نفاست کے ساتھ آراستہ تھے اور پھولوں کی خوشبو سے معطر!

صحن میں روشیں، پھولوں کی کیاریاں، سنگ مرمر کے فوارے، ریشمی پردے، قیمتی تصویریں، ایرانی قالینوں کا فرش، نہایت عمدہ قسم کا فرنیچر، فانوسوں کی روشنی، الغرض ہر وہ چیز جو ایک خوش ذوق دولتمند کے مکان میں ہونا چاہئے، یہاں موجود تھی

مختار آفندی، فاطمہ کو صحن کے درمیانی فوارہ کے پاس لے گیا اور وہاں ایک نرم مسہری پر بٹھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا کہ "آج تک میں اس مکان کا مالک تھا، لیکن اس وقت سے تم نہ صرف اس مکان بلکہ ہر اس چیز کی مالک ہو جو تمھیں یہاں نظر آتی ہے۔ اس وقت تک تمھارا ماضی جس طرح بھی بسر ہوا ہو، مجھے اس سے بحث نہیں، نہ اس کے ذکر کی ضرورت، لیکن تمھارے حال و مستقبل کے متعلق مجھے صاف صاف کہدینا چاہئے کہ وہ صرف تمھارے ہاتھ میں ہے اور مجھے دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ دُنیا کی ہر وہ راحت جو دولت سے حاصل کی جا سکتی ہے، تمھارا حق ہے اور اس زندگی کی ہر وہ مسرت جسے تم حاصل کرنا چاہتی ہو میری طرف سے اس کی اجازت ہے"

فاطمہ، اپنے بوڑھے شوہر کی ان پُرشباب باتوں کو سنکر حیران تھی، وہ تعجب کر رہی تھی کہ اس کے ہاتھ کی گرمی، اسکے لب و لہجہ کا

جوش، اس کی آواز کی مردانہ کھنک، سب اس بات کا ثبوت تھیں کہ اس کا شوہر شباب کی تمام کیفیات کا حامل ہے، لیکن جسوقت وہ اس کی موٹی بھدی ناک، لمبی داڑھی، کمروہ صورت اور ضعیف خط و خال کو دیکھتی تو پھر مضمحل ہو کر نگاہیں نیچی کر لیتی اور دل ہی دل میں کڑھ کر رہ جاتی

باتوں ہی باتوں میں نصف شب گزر گئی اور مختار آفندی، فاطمہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیکر اس سے رخصت ہو گیا۔

فاطمہ ساری رات جاگتی رہی، تنہا اپنے کمرہ میں پڑی سوچتی رہی کہ یہ کیا معمہ ہے، یہ کیسا انسان ہے اور اسکے ظاہر و باطن میں کیوں اتنا فرق نظر آتا ہے۔ پچھلے پہر اس کی آنکھ لگی بھی تو وہ اسی قسم کے مبہم خواب دیکھتی رہی، یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور جب اُس کی آنکھ کھلی تو چمن کی چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور خوشبو کی لپٹیں کھڑکیوں سے آ رہی تھیں

وہ ابھی پوری طرح بیدار بھی نہ ہوئی تھی کہ مختار آفندی آیا اور اس نے فاطمہ سے کہا کہ "میں ایک ضروری کام سے باہر سفر پر جا رہا ہوں اور غالباً دو مہینے تک واپس نہ آسکوں گا، میں اپنے پیچھے اپنے خادم سعید کو چھوڑے جاتا ہوں جو ہر طرح تمہاری آسایش کی فکر رکھے گا اور اپنے لطایف سے تمہارا جی بہلاتا رہے گا

فاطمہ نے یہ سنکر کہا کہ "کیا سعید اُس تکلیف کا بدل ہو سکتا ہے جو آپ کے نہ ہونے سے مجھے پہونچے گی"۔ اور یہ پہلا جملہ تھا جو شادی کے بعد اس کے منہ سے نکلا

مختار نے کہا کہ "نہیں، میں نے اپنے بھتیجے شکیب کو بھی اطلاع دیدی ہے، وہ یہاں آئے گا اور تمہاری تنہائی کی تکلیف کو پوری طرح دور کرے گا۔ یہ نہایت نیک و سنجیدہ نوجوان ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کی موجودگی میں تم مجھے کم یاد کرو گی"

فاطمہ اس کے جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ مختار، خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا

تین دن گزر گئے اور سعید نے فاطمہ کا دل بہلانے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اُٹھا رکھا۔ وہ عمدہ عمدہ کہانیاں سناتا، اچھے اچھے لطیفوں سے دل خوش کرتا، یہاں تک کہ فاطمہ اپنی تنہائی کی تکلیف کو بھول چلی۔ چوتھے دن سعید نے آکر خبر سنائی کہ شکیب آگئے ہیں اور ان کا سلام فاطمہ کو پہونچایا

فاطمہ، سعید کے لطایف و ظرایف میں بالکل بھول گئی تھی کہ اس کے شوہر نے شکیب کا ذکر کیا تھا اور وہ آنے والا تھا۔ اس نے سلام کا جواب کہلا بھیجا اور سعید کو حکم دیا کہ شکیب کی راحت و آسایش کا انتظام کر دیا جائے۔ چنانچہ شکیب کو ایک تنہا کمرہ میں ٹھیرا دیا گیا، اور فاطمہ پھر سعید کی باتوں سے اپنا دل بہلانے لگی

ایک دو دن گزرنے کے بعد سعید نے شکیب کا ذکر چھیڑ کر فاطمہ سے کہا کہ "آپ ابھی تک اپنے مہمان سے ملیں نہیں، حالانکہ وہ صرف مہمان ہی نہیں، بلکہ آپ کے شوہر کا بھتیجا بھی ہے اور اپنے اخلاق کے لحاظ سے نہایت اچھا انسان ہے"

فاطمہ نے اول اول تو اس موضوع کو ٹالنے کی کوشش کی، لیکن جب سعید کا اصرار بڑھا تو اس نے کہا کہ "ہاں شکیب کی تعریف میرے شوہر نے بھی کی تھی، لیکن میں نہیں سمجھتی کہ اپنے شوہر کی غیبت میں کسی نوجوان مرد سے ملنا میرے لئے کہاں تک مناسب ہے۔ علاوہ اس کے میں یوں بھی ہر اس چیز سے علیحدہ رہنا چاہتی ہوں جو کیفیات شباب کی یاد مجھے دلائے"

سعید تو یہ جواب سنکر چلا گیا، لیکن فاطمہ نے یہ سوچکر کہ یوں دور سے شکیب کو دیکھ لینا شاید گناہ نہ ہو، چلمن کی اوٹ سے نیچے دیکھا تو شکیب صحن میں ٹہل رہا تھا اور گن گنا تا جاتا تھا

فاطمہ کی زندگی میں یہ بالکل پہلا موقعہ تھا کہ اس نے احساسِ شباب سے واقف ہونے کے بعد واقعی کسی پُر شباب مرد کو دیکھا ہو۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ چچا بھتیجے میں کتنا فرق ہے۔ شکیب نہایت خوبصورت سڈول جسم کا انسان تھا، اور سوائے اس کے کہ نقشہ میں تو ضرور تھوڑی سی مشابہت پائی جاتی تھی، شکیب اور مختار آفندی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ شکیب کو دیکھتے ہی اسے اپنے شوہر کی بڑی داڑھی، موٹی بھدی ناک اور ٹیڑھی کمر یاد آگئی اور اس نے فوراً دروازہ بند کرلیا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ بیک وقت دماغ میں ان دو تصویروں کا اجتماع بھی شاید جایز نہیں اور اس نے اپنے آپ کو ملامت کرنا شروع کی کہ کیوں اس نے شکیب کو دیکھا

دو ہفتے گزر گئے اور اس دوران میں وہ بڑی مشکل سے شکیب کے نفوس کو اپنے دماغ سے نکالنے میں کامیاب ہوسکی۔ اس نے سعید سے کہدیا تھا کہ آیندہ شکیب کا نام بھی اس کے سامنے نہ لیا جائے، اس لئے وہ بھی خاموش رہا اور اس طرح فاطمہ آہستہ آہستہ اپنے دل سے اُس داغ کے مٹانے میں کامیاب ہوگئی، جس نے ابھی زخم کی صورت اختیار نہ کی تھی

ایک رات وہ اپنے شوہر کے خیال کے ساتھ ساتھ اپنے مستقبل پر غور کر رہی تھی کہ نیچے صحن سے شکیب کے گانے کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ وہ چونک پڑی، جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، وہ بیتابانہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے چاہا کہ چلمن کو اُٹھا کر شکیب کو دیکھے، لیکن پھر رُک گئی۔ گانے کی آواز اس کے کانوں میں آرہی تھی اور اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہوتا جارہا تھا۔ آواز کی دلکشی، جس میں جذبات کی آگ بھی کام کر رہی تھی، فاطمہ کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی کہ اگر وہ چیخ مار کر باہر نہ نکل پڑی تو بیہوش ہوکر گر جائے گی۔ شکیب کی آواز اور بلند ہوتی جارہی تھی اور گیت کے بول جو جذبات محبت میں ڈوبے ہوئے تھے، فاطمہ کی رگ رگ میں نشتر بن کر دوڑ رہے تھے۔ اس کا ہاتھ بے اختیارانہ دروازہ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ احساس میں پھر ردعمل شروع ہوا اور اس نے کوشش کی کہ شکیب کی طرف سے نفرت پیدا کرنے کے لئے اس کے نقایص تلاش کرے، اور آخر کار اس نے شکیب کی اس اخلاقی کمزوری کو سامنے رکھ کر کہ وہ رات کو اس قدر آزادی اور بیباکی کے ساتھ کیوں اس کے کمرہ کے پاس گا رہا ہے، دروازہ بند کرلیا اور دونوں کانوں پر تکیے رکھ کر (تاکہ وہ شکیب کی آواز نہ سن سکے) لیٹ گئی

اس واقعہ کو بھی تین دن گزر گئے اور فاطمہ نے ایک لمحہ کے لئے بھی دریچہ نہیں کھولا کہ مبادا شکیب یا اُس کی آواز کا پھر اسے مقابلہ کرنا پڑے، لیکن وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ اس دوران میں شکیب نہ اپنے کمرہ سے باہر آیا، نہ باہر صحن میں نکل کر اس نے کوئی نغمہ چھیڑا۔ فاطمہ کو اُلجھن تھی کہ اس کا سبب معلوم کرے، چنانچہ اس نے اپنے شوہر کا ذکر کرتے ہوئے خود شکیب کا نام لیا اور ایک میزبان کی حیثیت سے اس کی صحت و عافیت دریافت کی

سعید نے نہایت مغموم لہجہ میں جواب دیا کہ "وہ تو تین دن سے بیمار ہے اور آج حالت زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے"۔ فاطمہ یہ سنکر چونک پڑی، اس کے دل کو تکلیف ہوئی اور اپنی بداخلاقی پر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی۔ اس نے سعید سے پوچھا کہ "تم نے کیوں اس وقت تک اطلاع نہیں دی"۔ لیکن سعید نے اس کا تو کوئی جواب نہیں دیا اور بولا کہ "مناسب یہی ہے

کہ آپ خود جاکر مزاج پُرسی کریں کیونکہ شکیب علاوہ مہمان ہونے کے آپ کے شوہر کا بھتیجہ بھی ہے اور یہ بات بہت بُری ہے کہ وہ بیمار ہو اور آپ اس کی عیادت کو نہ جائیں"

فاطمہ، جو شکیب کی بیماری کا حال سُنکر پہلے ہی بیتاب ہوگئی تھی، چادر سر پر ڈال کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور سعید سے کہا کہ مجھے وہاں لے چلو۔ لیکن حال یہ تھا کہ دل بلیوں اُچھل رہا تھا اور پاؤں ایک ایک من کا تھا

جس وقت وہ شکیب کے حجرہ میں داخل ہوئی، اس کا جسم کانپ رہا تھا، ریشہ ریشہ تھرتھرا رہا تھا اور شاید وہ دروازہ ہی پر گر جاتی اگر شکیب اُٹھکر اس کا ہاتھ نہ پکڑ لیتا

فاطمہ بستر کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ لیکن بالکل خاموش، نہ وہ شکیب کو دیکھنا چاہتی تھی اور نہ اس کے مُنھ سے کوئی لفظ نکل رہا تھا۔ اس سکوت کو توڑنے کے لئے سعید نے شکیب سے کہا کہ "آپ کی بیماری کا حال ان کو بالکل معلوم نہ تھا، ورنہ شاید اس سے پہلے ہی آپ کی عیادت کے لئے آتیں"

یہ کہکر سعید چلا گیا، لیکن اس تنہائی سے فاطمہ کی زبان کو اور زیادہ مقفل کر دیا اور بدستور خاموش بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد شکیب نے کہا کہ "میں آپ کی تکلیف فرمائی کا بہت شکر گزار ہوں اور نہیں کہہ سکتا کہ اس سے مجھے کتنی راحت پہونچی ہے۔ سنا کرتا تھا کہ بعض انسان مسیحائی بھی کر سکتے ہیں، اور آج میں نے خود اس کا تجربہ کر لیا۔ کیونکہ میں اب اپنے آپ کو بالکل تندرست پاتا ہوں" ——— فاطمہ: "آپ کو کیا شکایت ہے"

شکیب: "مجھے نہیں معلوم"

فاطمہ: "لیکن آپ تو خود طبیب ہیں، آپ کو جاننا چاہیئے"

شکیب: "ہاں یہ وہ مرض نہیں جسے طبیب پہچان سکے"

فاطمہ: "تاہم کوئی نہ کوئی سبب تو ہونا چاہیئے"

شکیب: "ہے، اور اس سے میں واقف بھی ہوں"

فاطمہ: "فرمایئے"

شکیب: "سچ پوچھئے تو میری بیماری کی ابتدا اسی دن سے ہوتی ہے جب میں اس مکان میں داخل ہوا اور میں نے چلمن کے پیچھے کسی کی جھلک دیکھی، اس کے بعد جب نگاہوں سے میرے دل پر تیر چلائے گئے، تو میری حالت اور زیادہ سقیم ہوگئی اور پھر جب چہرہ دکھا کر دفعتاً چھپا لیا گیا، تو میں نے ایسا محسوس کیا کہ میری زندگی کا آفتاب غروب ہوگیا ہے اور میں چند ساعت کا مہمان ہوں"۔ شکیب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، لیکن فاطمہ نے نہ شکیب کی اس دلدوز داستان کی پروا کی نہ اسکی اشکباری کی، وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور کمرہ سے باہر چلی گئی

اس دن کی شام ہوگئی، لیکن کس کرب و اضطراب کے عالم میں، اس کا علم صرف فاطمہ کو تھا یا شکیب کو۔ فاطمہ جانتی تھی کہ جو آگ اس کے دل میں بھڑکی تھی اس نے شکیب کو بھی تڑپا رکھا ہے اور اگر یہ دونوں شعلے کسی وقت ملگئے تو ممکن ہے شکیب صبر و ضبط سے کام لے سکے، لیکن وہ یقیناً جلکر خاک ہو جائے گی، اس لئے اس نے عہد کیا کہ اب وہ شکیب کے پاس نہ جائے گی

لیکن ابھی اس عزم پر وہ استوار بھی نہ ہوئی تھی کہ سعید دوڑا ہوا آیا اور بولا کہ "شکیب کی حالت بہت نازک ہے اور شاید وہ دم توڑ رہا ہو"

فاطمہ گھبرا کر پیر اُٹھ کھڑی ہوئی، اور شکیب کے حجرہ کی طرف چل دی وہ اندر پہونچی ہی تھی کہ شکیب نے بیتابانہ اپنی آغوش کھولدی اور بولا کہ "اے فاطمہ، میری زندگی ختم ہو رہی ہے، اس لئے اگر میں ایکبار تمھارے سر کو اپنے سینے سے لگا سکا تو ممکن ہے میری روح کو کچھ سکون ہو، ورنہ مرنے کے بعد بھی میرا یہ درد کم نہ ہوگا"

فاطمہ کچھ جھجکی اور چاہا کہ پلٹ جائے، لیکن یہ سمجھ کر کہ اب وقت صاف صاف بات کرنے کا ہے بولی کہ "اے شکیب تمھیں معلوم ہے کہ میری شادی ہو چکی ہے اور میرا شوہر تمھارا چچا ہے، اس لئے تمھیں سوچنا چاہئے کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور میں کیونکر اسے منظور کر سکتی ہوں"

شکیب: "میں یہ سب جانتا ہوں، لیکن کیا کروں محبت اپنے اختیار کی چیز نہیں، علاوہ اس کے مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میرا چچا ذیابیطس میں مبتلا ہے اور چند دن سے زیادہ اسے جینا نہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم میری محبت کو رد کرو جس کی عمر شاید زیادہ پایدار ثابت ہو"

فاطمہ: "یہ سب صحیح ہے، لیکن جب تک میرا شوہر زندہ ہے، میں کبھی اس خیانت کی مجرم نہیں ہو سکتی"

شکیب: "تو اس کے معنے یہ ہیں کہ میں مر جاؤں"

فاطمہ: "اگر آپ مر گئے (حالانکہ میں یہ نہیں چاہتی) تو میں یقیناً آپ کے شباب پر آنسو بہاؤں گی اور آپ کی محبت ہمیشہ یاد رکھونگی لیکن، زندگی میں تو شاید میں یہ بھی نہ کر سکوں گی"

فاطمہ، یہ کہہ کر فوراً باہر نکل گئی اور شکیب کو جواب دینے کا بھی موقعہ نہ دیا۔

شکیب کو گئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا ہے اور فاطمہ بدستور اپنے مکان میں مختار آفندی کی واپسی کا انتظار کر رہی ہے ایک دن شام کو دفعتاً سارے قاہرہ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ "حکومت عثمانی میں انقلاب ہو گیا اور انجمن اتحاد و ترقی کے ممبروں نے حکومت اپنے ہاتھ میں لیلی ہے — اور — اس خبر کے ساتھ ہی فاطمہ کے مکان پر لوگوں کا ہجوم ہونے لگا اور خوشی کے نعرے ہر طرف سے بلند ہونے لگے۔ فاطمہ حیران تھی کہ یہ کیا بات ہے اور اس نے دریچہ سے سر نکالکر ان لوگوں کو دیکھنا ہی چاہا تھا کہ اس مجمع میں اسے مختار آفندی بھی نظر آیا، جس سے لوگ گلے مل رہے تھے اور کامیابی کی مبارکباد دے رہے تھے۔ سعید بھی قریب ہی تھا

مختار آفندی نے اس جلسۂ تہنیت کے بعد فاطمہ کے حجرہ کا رُخ کیا، لیکن سعید سامنے آگیا اور بولا کہ اب آپ اس طرح نہیں جا سکتے۔ اور یہ کہکر اس نے ایک ہاتھ داڑھی پر ڈالا اور دوسرا ناک پر تو داڑھی بھی الگ ہو گئی اور ناک کا خول بھی جدا ہو گیا — فاطمہ یہ تمام منظر دیکھ رہی تھی اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مختار آفندی اور شکیب ایک ہی شخص ہیں۔

اس کے کئی دن بعد فاطمہ کو معلوم ہوا کہ "مختار آفندی" نوجوان ترکوں کی جماعت کا بڑا سربرآوردہ شخص تھا اور وضع و صورت بدل کر مصر آگیا تھا تاکہ حکومت عثمانی کے جاسوس اس کو گرفتار نہ کر سکیں۔

مٹی سے سونا

فارسی کی مشہور مثل ہے کہ "داشتہ آید بکار" اور ہمارے یہاں کی بڑی بوڑھیاں اب بھی اس پر عامل نظر آتی ہیں، لیکن اس سے صرف یہ فایدہ ہوتا ہے کہ ضرورت کے وقت رسّی کا کوئی ٹکڑا ملگیا، یا کوئی ٹوٹا ہوا برتن ہاتھ آگیا — لیکن یوروپ اسپر عمل کرکے جس قدر فایدہ اُٹھا رہا ہے، اس کو بھی سُن لیجئے۔

سائنس کا دعویٰ ہے کہ لفظ 'بیکار' کے کوئی معنی نہیں، اگر آپ کسی چیز کے استعمال سے واقف نہیں تو اس کے معنے یہیں کہ آپ خود اس چیز کے لئے بیکار ہیں۔ وہ چیز بیکار نہیں۔

کسی چیز کے بیکار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز غلط جگہ پر رکھدی گئی ہے اور اگر ہم اُس کی جگہ بدل دیں تو وہ کار آمد ہوجائے۔ ہمارے اور آپ کے گھروں سے سیکڑوں من کوڑا کرکٹ نکلتا ہے، ردی کاغذ جمع رہتے ہیں اور پُرانے ازکار رفتہ کپڑوں کا ڈھیر نظر آتا ہے، لیکن یہ سب اس وقت تک بیکار ہیں جب تک وہ گھروں میں ہیں۔ جوں ہی ان کو گھر سے کوڑے خانہ میں منتقل کیا گیا اور وہ باکار ہوگئیں۔ ہندوستان میں تو اس ذخیرے سے گڈھے پاٹنے یا زیادہ سے زیادہ کھاد بنانے کا کام لیا جاتا ہے لیکن دُنیا کے تعلیم یافتہ ممالک میں کوڑے کے اس ڈھیر سے سونا پیدا کیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ برمنگھم شہر کو لیجئے، جہاں شہر کے کوڑے کرکٹ سے ایک سال میں ۷ ہزار پونڈ کی کھاد، ۴ ہزار پونڈ کی چربی، ½ ۳ ہزار پونڈ کے جھنجھنے اور ۱۶ ہزار پونڈ کی اور مختلف اشیاء طیار کی جاتی ہیں۔ برمنگھم دُنیا کا پہلا شہر ہے جہاں اس طرف توجہ کی گئی تھی۔ اور چند ہی سال کے اندر یہ اسکیم اس قدر کامیاب ہوئی کہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے ساٹھ ہزار پونڈ کی قیمت کا سامان تیار کیا جانے لگا۔

برمنگھم کے بعد دوسرا قابل ذکر شہر بریڈفورڈ (Bradford) ہے وہاں کا مشہور کارخانہ (Sausage Works) ہے جس نے قلیل عرصہ میں تیرہ لاکھ پونڈ سے زاید کی اشیا کوڑے سے تیار کیں۔ یہ طریقہ ابھی انگلستان میں بھی عام نہیں ہوا ہے اور وہاں بھی اکثر شہروں میں اس قیمتی چیز سے صرف کھاد ہی بنانے کا کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف ایک لندن کے شہر میں بیس لاکھ ٹن کرکٹ ضایع کردیا جاتا ہے جس سے کم از کم دو لاکھ پچاس ہزار پونڈ کی رقم پیدا کی جاسکتی ہے۔ امریکہ اس باب میں انگلستان سے بہت آگے ہے۔ کوڑے کرکٹ کو تو جانے دیجئے وہاں نالی کے گندے پانی سے ایک قسم کی گیس تیار کی جاتی ہے جو انجنوں کے اندرونی حصہ کو گرم کرنے کے کام آتی ہے۔ چنانچہ امریکہ نے اس تجربہ کے پہلے ہی سال میں ایک مہینے کے اندر نالیوں کے اندر بہنے والی نو کروڑ گیلن عفونت سے چار لاکھ مکعب فٹ گیس تیار کی جس میں ۲۵ ہزار گھوڑوں کی طاقت تھی۔

اس گیس کو پٹرول انجنوں میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ انجن سے کاربوریٹر (Carburettor) کو علٰحدہ کر دیتے ہیں اور سلنڈروں میں گیس پائپ لگا دیتے ہیں - اس گیس کو دوسری مشینوں میں کوئلہ کی جگہ بھی استعمال کیا جاتا ہے اس سے ایک طرف یہ فایدہ ہے کہ کوئلہ لاکر ڈھیر کرنے کی مصیبت سے چھٹکارا مل گیا اور دوسری طرف راکھ وغیرہ صاف کرنے کی محنت بھی بچ گئی -

اسکاٹ لینڈ کے شہر آبرڈین (Aberdeen) میں ایک سال کے اندر بیس ہزار ٹن کوڑے کرکٹ سے ۵۲۰۲ ٹن عمدہ مٹی، ۱۰۹۱ ٹن کارآمد کوئلہ، ۲۰۲۱ ٹن ٹین، ۳۰ ٹن مختلف اقسام کی قیمتی دھاتیں اور ان کے علاوہ کچھ اور بھی مفید اشیاء نکالی گئیں جن کی مجموعی قیمت ۸ سو پونڈ تھی، اُسی سال ایک کارخانہ میں شہر کے فضلہ سے پچیس ہزار پونڈ کی بجلی کی قوت طیار کی گئی - گلاسگو میں ۳۳-۱۹۳۲ء میں اکتیس ہزار ٹن کوئلہ کی طاقت کی بجلی بنائی گئی - گلاسگو گیس کمپنی نے اگست ۱۹۳۴ء میں ادویات کے فضلہ سے پانچ ہزار ٹن بنزول فلوئیڈ (Benzol Fluid) تیار کی جو دو شلنگ تین پنس فی گیلن کے حساب سے فروخت ہوئی -

صنعتی علاقوں میں چمنیوں کے اندر دھوئیں کی جو پرت سی جم جاتی ہے، اُس میں ایک بیحد مفید اور قیمتی مادہ ہوتا ہے جو ٹیلیوژن (Television) اور بجلی سے تصویر کشی (Phto-electric cells) کے آلات بنانے میں کام آتا ہے - اب تک اس مادہ سے بہت کم کام لیا گیا ہے اور تخمینہ لگایا جاتا ہے کہ ہر سال کم از کم دس لاکھ پونڈ کی قیمت کا یہ مادہ ضایع کیا جاتا ہے - اس مادہ سے ایک دھات بھی نکالی جا سکتی ہے جسے (Germanium) کہتے ہیں جو ادویات کی تجربہ گاہوں میں بہت کام آتی ہے -

آیوڈین (Iodin) ایک مشہور انگریزی دوا ہے جو کثرت کے ساتھ استعمال بھی کی جاتی ہے - یہ دوا آج کل کثرت کے ساتھ کیلیفورنیا (California) کے تیل کے اُس فضلہ سے نکالی جاتی ہے جسکو پہلے بیکار سمجھا جاتا تھا -

اگر آپ سے یہ کہا جائے کہ تیل سے پانی نکالا جا سکتا ہے اور وہ پانی صاف شفاف اور شیریں ہوتا ہے تو آپ مشکل سے باور کریں گے کیونکہ یہ ایک عام خیال ہے کہ تیل اور پانی شیر و شکر ہونا تو درکنار یکجا نہیں ہو سکتے - لیکن یہ حقیقت ہے کہ جہاز کی مشینوں کے استعمال شدہ تیل سے پانی نکالا جاتا ہے اور انسان اُس کو بلا تکلف استعمال کرتا ہے - پہلے یہ تیل سمندر کی گہرائی میں ڈال دیا جاتا تھا - اس میں ایک قسم کا زہر بھی ہوتا ہے جس سے مچھلیاں اور آبی چڑیاں مر جاتی تھیں، مگر اب اُس تیل سے پانی علٰحدہ کیا جاتا ہے اور تیل جو بچ جاتا ہے اُس کو پھر خالص تیل کی طرح استعمال کیا جاتا ہے -

انسان ابتدا میں پٹرولیم (Petroleum) سے صرف دو چیزیں بنانا جانتا تھا، پیرافین (Paraffin) اور مٹی کا تیل، پٹرول جو اس کا اصل جوہر ہے انسان اُس کو عرصہ تک مفضول سے تعبیر کرتا رہا، لیکن آج یہی سب سے زیادہ کارآمد چیز سمجھی جاتی ہے - پٹرولیم کے علاوہ اور بھی متعدد طریقوں سے پٹرول بنایا جاتا ہے، ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی پہلے کوئی قدر و قیمت نہ تھی - مثال کے لئے آپ شیرہ کو لیں جو شکر سازی کے کارخانوں میں کثرت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے - پہلے شیرہ سے زیادہ سے زیادہ کشیدنی تمباکو طیار ہوتا تھا (وہ بھی صرف ہندوستان میں) - لیکن آج اسی شیرے سے پٹرول نکالا جاتا ہے اور صرف پٹرول ہی نہیں بلکہ الکوحل (جوہر شراب) بھی بنانے کی کوشش کی گئی ہے -

اسکاٹلینڈ کے ایک شہر میں ایک خاص قسم کی مٹی پائی جاتی ہے جو سلیٹ کی طرح ہوتی ہے اور اُس مٹی سے اسپرٹ، مٹی کا تیل اور (Naphtha) نکالے جاتے ہیں۔ یہ چیزیں نکالنے کے بعد جو فضلہ بچ رہتا ہے اُس سے اینٹیں بنائی جاتی ہیں جو بہت پائیدار ہوتی ہیں۔ اسی طرح کوڑے کرکٹ سے مصنوعی پتھر بنائے جاتے ہیں جن کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان پر آگ اور موسم کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

کچھ عرصہ پہلے تک دنیا تارکول جیسی مفید اور قیمتی چیز کے فوائد سے قطعاً ناآشنا تھی، لیکن آج اُسی سے ایک خاص قسم کا رنگ جسے (Hanne dye) کہتے ہیں تیار کیا جانے لگا ہے جو کارخانہ داروں کے لئے بہت کارآمد ہے اس ایجاد کا سہرا ایک انگریز ماہر ادویات سر ہنری پرکن (Henry Parkin) کے سر ہے، جنھوں نے سب سے پہلے دنیا کو اس سے روشناس کیا۔ متذکرۂ بالا رنگ کے علاوہ تارکول سے اسپرین (aspirin) بنائی جاتی ہے جو ڈاکٹروں کے لئے بہت اہم چیز ثابت ہوئی ہے، تارکول سے عطریات وغیرہ کے مرکب بنانے میں بھی امداد لی جاتی ہے۔

ہمارے اور آپ کے گھروں میں روزانہ سیب کا اندرونی حصہ، نارنگی اور سنترہ کے چھلکے، ہڈیاں، پرانے کپڑے اور خدا جانے ایسی ہی کتنی چیزیں باہر پھینک دیجاتی ہیں اور ہم لوگ یہ محسوس بھی نہیں کرتے کہ اُن سے کوئی کارآمد چیز طیار کی جا سکتی ہے۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ سیب کا اندرونی حصہ جیلی بنانے کے لئے بیحد ضروری ہے کیونکہ اگر یہ چیز اس کے مرکب میں نہ ہو تو وہ جم ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح سے سنترہ وغیرہ کے چھلکوں سے متعدد اقسام کے تیل نکالے جاتے ہیں۔

ہڈی کو اگر پانی میں جوش دیا جائے تو ایک قسم کا لیسدار مادہ پیدا ہوتا ہے یہ مادہ چاکلیٹ اور دوسری مٹھائیاں اور دوائیں طیار کرنے میں کام آتا ہے۔ اس مادہ کے نکالنے کے بعد جو فضلہ رہ جاتا ہے اُس میں فاسفورس کا کافی جزو رہتا ہے اور اُس سے مصنوعی کھاد بنائی جاتی ہے۔

پُرانے کپڑوں کا جہاں تک تعلق ہے ہم لوگ یہ تو عام طور پر جانتے ہیں کہ اُس سے کاغذ طیار کیا جاتا ہے۔ لیکن اُس سے زیادہ حیرتناک امر یہ ہے کہ پُرانے کپڑوں کو سڑا کر ایک خاص قسم کی روئی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور پھر اُس سے ریشمی کپڑوں کے لئے سوت طیار کئے جاتے ہیں۔ یارک شائر، ڈوزبری (Deesbery) اور دوسرے صنعتی شہروں میں بہت سے مزدور اس کام میں لگے رہتے ہیں لارڈ بریڈفورڈ (Bard ford) جو ایک زمانہ میں دیوالہ پن کی حد تک پہونچ چکے تھے آج اسی صنعت کی بدولت دنیا کے خاص دولتمندوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

حال ہی میں پتہ چلا ہے کہ بحرمردہ (Dead Sea) میں ایک کروڑ بیس لاکھ ٹن مختلف اقسام کے نمک پائے جاتے ہیں اور ہر سال اس ذخیرہ میں تقریباً ۱۵۰۰۰ ٹن کا اضافہ ہوتا ہے۔ نمک کے علاوہ اس سمندر میں ایک ارب ٹن پٹاس اور ۸۰ کروڑ ٹن بروین (Bromine) بھی ہے۔ دنیا آج جس مقدار میں ان دونوں چیزوں کو استعمال کرتی ہے اُس کے حساب سے یہ ذخیرہ ایک ہزار سال کے لئے کافی ہوگا۔ یہ چیزیں بحرمردہ کی اہم ترین دولت سمجھی جاتی ہیں۔ بروین سرخی مائل بھورے رنگ کی گیس ہوتی ہے جس سے سوڈیم بروماٹیڈ (Sodiam Bromide) امونیم بروماٹیڈ (Amoniam Bromide) اور پوٹیشیم بروماٹیڈ (Potassium Bromide) وغیرہ طیار کی جاتی ہیں۔ یہ چیزیں ادویات، فوٹوگرافی اور رنگنے کے کام میں آتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم چیز پٹاش ہے جو ایک سفید نمک ہوتا ہے اور جو گولے بارود کے لئے بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس سمندر میں میگنیشیم (Magnesium) بھی پایا جاتا ہے جو مسین سے روئی کاتنے کے لئے بہت مفید ہوتا ہے اور سیمنٹ بنانے کے کام میں بھی آتا ہے۔ سائنسداں کم و بیش نصف صدی سے بحرمردہ (Dead Sea) کی دولت کا سراغ لگانے میں مشغول تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل ذکر نام مسٹر نووسکی (Novomeysky) کا ہے جو ۱۹۱۲ء کی لڑائی سے پہلے اس کام میں لگے ہوئے تھے۔ اب وہ فلسطین کی پٹاس کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں فلسطین اور ٹرانس جارڈائن کی حکومتوں سے انھوں نے خاص مراعات حاصل کی ہیں۔ یوں تو یہ کارخانہ غیر سرکاری ہے لیکن وہاں کی حکومت کا بھی اُن میں خاصہ حصہ ہے اور ستر سال کے بعد یہ کارخانہ حکومت کی ملک ہو جائے گا اس کارخانے نے ۱۹۳۲ء میں ۱۵۰ ٹن بروماٹن اور دس ہزار ٹن پٹاش طیار کی۔

گورکن

دونوں آدھی سے زیادہ قبر کھود چکے تھے اور پسینہ اُن کے جسم پر قطروں کی شکل اختیار کرنے کے بعد جلد کی بعض شکنوں میں پھیل رہا تھا۔ اب تک انھوں نے آپس میں بہت کم باتیں کی تھیں لیکن اب تھکن کے احساس نے باتوں کا بہانہ ڈھونڈ نکالا تھا اور وہ اپنی کدالیں روک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور کوئی غیر ضروری بات چھیڑ دیتے جو زیادہ دیر تک نہ چل سکتی۔ ان میں سلیم جوان تھا اور علی بخش بوڑھا۔ دونوں کے خاندان میں یہ کام نہ جانے کب سے چلا آرہا تھا۔ بوڑھا بعض مرنے والوں کے قصے سنا تا رہا پھر کسی نے آکر جلدی کرنے کے لئے کہا اور دونوں اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔

زمین بہت سخت تھی اور کنکریلی، پھاوڑے اور کدال کی چوٹ پر چیخ اُٹھتی لیکن آسانی سے کٹنے کا نام نہ لیتی۔ دوپہر ڈھل رہی تھی زمین اندر اور زیادہ گرم تھی، تازی تازی مٹی سے گرم خوشبو نکل رہی تھی اور دونوں گورکن اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ آس پاس سناٹا تھا، چند بڑے بڑے درخت، کچھ بے ترتیب جھاڑیاں، خار دار پودے اور اونچی نیچی زمین، یہ تمام چیزیں فضا سے ہم آہنگ معلوم ہوتی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دور پر قبریں مختلف رقبوں اور نئی یا پرانی ہونے کی وجہ سے مختلف صورتوں کی تھیں۔ بوڑھے گورکن نے بعض بہت پرانی قبروں کی طرف اشارہ کرکے بتایا کہ وہ فلاں فلاں کی قبریں ہیں۔ بعض کے بارے میں اس سے یہ بھی بتایا کہ ان کے طیار کرنے پر اُسے کتنا ملا تھا، وہ ان باتوں کو لذت لے لے کر بیان کر رہا تھا اور سلیم حیرت سے انھیں سُن رہا تھا۔ سلیم کسی قدر پڑھ لکھ لیتا تھا اس لئے ایک قبر کے کتبے کی طرف اشارہ کرکے علی بخش نے سلیم سے اُس کے پڑھنے کے لئے کہا، جس سے معلوم ہوا کہ کسی مسافر کی قبر ہے جس کے ورثاء نے بہت عرصہ بعد پتہ چلا کر اُس پر ایک پتھر نصب کرا دیا تھا۔ یہ سب باتیں ہو رہی تھیں کہ علی بخش کی کدال کسی سخت چیز پر پڑی اور دوسری دفعہ زور لگانے پر انسانی ہڈی کا ایک ٹکڑا چور چور ہوکر باہر نکل آیا۔ علی بخش مسکرایا، ایک لمحہ میں اُس کے دماغ کے اندر موت اور زندگی کے بہت سے خاکے بن کر مٹ گئے۔ ایک ہاتھ میں کدال لے کر دوسرے ہاتھ سے اُس نے ہڈی باہر کھینچ لی، گلی ہوئی سفید سی چیز جس کی مدت کا اندازہ بھی علی بخش یا سلیم نہ کر سکتے تھے۔ سلیم کو اس سے پہلے کبھی اس کا اتفاق نہ ہوا تھا اسلئے وہ کسی قدر خوفزدہ ہوگیا لیکن علی بخش نے لاپروائی سے اُسے الگ پھینک دیا۔

"معلوم ہوتا ہے پہلے یہاں کسی کی قبر تھی! نہ معلوم کس کی ہوگی؟" سلیم نے کہا

علی بخش بولا "رہی ہوگی کسی کی، جب دنیا اتنی پرانی ہے تو روز نئی زمین کہاں سے آئے گی قبر کے لئے، اور مذہب بھی تو بتاتا ہے کہ قیامت کے دن ایک ایک قبر سے ستر ستر مُردے نکلیں گے۔ قیامت تک اس جگہ پر نہ جانے کتنے مُردے گاڑے جائیں گے۔

قبر قریب قریب مکمل ہوگئی تھی، سلیم تھکن اور گھبراہٹ کے احساس سے باہر نکل پڑا، وہ جوان ہونے کے باوجود علی بخش سے پہلے تھک گیا، کیونکہ ابھی تک اسے محنت کی زیادہ عادت نہ تھی، شہر سے ملا ہوا مگر شہر کے باہر قبرستان تھا دونوں اُسی کے

قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ شہر میں ہیضہ پھیلا ہوا تھا، دو ایک مسلمان بھی روزانہ مرتے تھے، ہندو مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اور علی بخش کبھی کبھی اپنے محدود دائرۂ علم کے مطابق مردوں کے دفن کرنے اور جلانے کے فلسفہ پر غور کرنے لگتا تھا آج بھی جو سلیم نے چھیڑ دیا تو اس کا دماغ وہیں پہونچ گیا، اُس کے پاس بہت تھوڑا سا کھیت تھا وہ اور چاہتا تھا لیکن نہ ملتا تھا، آخر مُردوں کے لئے اتنی زمین پڑی ہے، زندہ انسان زمین بغیر مر رہے ہیں، وہ رسم پرستیوں کے اس انوکھے فلسفہ سے واقف نہ تھا جس میں زندہ انسانوں سے زیادہ مردوں کی قدر ہوتی ہے پھر بھی اُس کا اپنا ذوق اور مالی منفعت کا نقطۂ نظر اُسے مسلمانوں ہی کے طریقہ کو بہتر سمجھنے پر مجبور کرتا تھا۔ سلیم باہر نکلا تو علی بخش بھی باہر آگیا۔ اُس نے مٹی بھرے ہاتھ سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور بولا:

سلیم! کیا تم ان مرے ہوئے لوگوں کی سڑی گلی ہڈیوں سے ڈر گئے؟" اُس نے کدال اندر ہی چھوڑ دی تھی، ہاتھ میں پھر وہی ہڈی کا ٹکڑا اُٹھا لیا اور اُسے دور پھینک کر زور سے ہنسا۔ سلیم بھی ایک خوفزدہ اور غمناک سی ہنسی ہنسا، وہ جوان تھا، کسی کسی وقت موت کا خیال اُسے افسانہ معلوم ہوتا تھا اور کسی وقت وہ موت کے نام سے ڈر جاتا تھا، ہیضہ شہر میں تھا اور اس کا گاؤں اس سے متاثر نہ تھا تاہم سلیم ڈر رہا تھا کیونکہ اسے ان دنوں پڑوس میں ایک لڑکی سے محبت ہو گئی تھی اور ایسی حالت میں کہ جب محبت کے کامیاب ہو جانے کی امید ہو بیمار ہونا یا مر جانا کیونکر گوارا ہو سکتا تھا، اسی لئے سلیم موت سے ڈرتا تھا۔ اس کی محبت کا حال علی بخش کو بھی معلوم تھا اور وہ اس فکر میں تھا کہ کسی دن سلیم سے اس کا راز دریافت کرے، آج تنہائی میں اس کا ساتھ ہوا تھا اور حالات نے فضا میں ایسا گداز پیدا کر دیا تھا کہ سلیم سے اس کا راز پوچھ لینا بہت مشکل نہ تھا۔ لیکن اُسی وقت علی بخش کو اپنی جوانی اور اپنی محبت کا زمانہ یاد آیا جس کی گہرائی اور تاثر میں راز معلوم کرنے کی آرزو اور جستجو کا جذبہ سب دفن ہو کر رہ گئے۔ اس کی نگاہ قبرستان کے ایک گوشے پر جا کر جم گئی اور چہرے پر مکمل افسردگی چھا گئی، زمین کی سطح ہموار تھی لیکن دور اس ویرانے کے کنارے پر وہ اپنی محبوبہ کی قبر دیکھ رہا تھا۔ اس نے اُسی طرف دیکھتے ہوئے سلیم سے پوچھا:

"سلیم! سنا ہے کہ تم محمود کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو، کوئی مجھ سے کہتا تھا" اس جملہ میں طنز، انکشاف راز کی کوشش یا کوئی اور جذبہ نہ تھا بلکہ وہ تو اب صرف اپنی محبت کا تذکرہ کرنے کے لئے ایک تمہید چاہتا تھا۔ سلیم کے چہرہ پر خون دوڑ گیا اور اُس نے سر جھکا لیا، اس کی مسکراہٹ میں حیا اور فخر کا پرتو بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ علی بخش اس وقت جواب سننا بھی نہ چاہتا تھا اس نے سلیم کا ہاتھ پکڑ لیا اور قبرستان کے اس حصہ میں لے گیا جہاں اس کی محبوبہ دفن تھی۔

"سلیم!" اُس نے یوں مخاطب کیا گویا وہ سب کچھ کہنے پر مجبور ہے۔ سلیم نے علی بخش کے ساتھ ہی رکتے ہوئے نظر اُٹھائی، علی بخش نے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"سائرہ کی قبر ہے سلیم! سائرہ کو تم نہیں جانتے اور جس طرح میں جانتا ہوں دوسرا کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہم دونوں ایکدوسرے سے محبت کرتے تھے، تم بھی محبت کرتے ہو شاید میری کہانی سمجھ سکو اس لئے کہتا ہوں، نہیں تو میری عادت نہیں ہے کہ میں اُسے دُہراؤں کیونکہ اس میں سائرہ کی رسوائی بھی تو ہے" یہ کہتے ہوئے اُس نے پھر ایک بار سناٹے پر نظر ڈالی۔ وہ ذرا دیر کے لئے رکا جیسے کہیں دور پہونچ گیا ہے اور واپس آنا چاہتا ہے یا اپنی کہانی کا سرا نہیں پاتا کہ کہاں سے شروع کرے، وہ بالکل خاموش کچھ دیر تک ایک تذبذب کے عالم میں رہا، یہاں تک کہ سلیم نے اُسے غور سے دیکھا کہ وہ خاموش کیوں ہو گیا۔ علی بخش ماضی کی دنیا سے واپس آیا اور جذبات کا ایک خزانہ ساتھ لایا، اُس کی بوڑھی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور اُس نے پھر کہنا شروع کیا:

"میں بھی کسی وقت تمہاری طرح تھا، آج جیسا تم مجھے کمزور دیکھ رہے ہو، ایسا نہیں، تم سے بھی زیادہ مضبوط اور تندرست"
اس کے بعد وہ کچھ اگلے وقتوں کی جوانی اور موجودہ دور کی جوانی پر تبصرہ کرنا چاہتا تھا لیکن ماضی کی دلکش یاد نے اُسے روک دیا، کہانی اُس کے گلے میں پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی وہ اُسے کہہ دینا چاہتا تھا اُس کے یہاں آج پہلی دفعہ یہ جذبہ شدت سے پیدا ہوا تھا کہ اپنی محبت کی داستان سُنا ڈالے ۔ "سائرہ میرے پڑوس میں رہتی تھی، دبلی پتلی اور زرد تھی، کبھی کبھی اس کا چہرہ سُرخ بھی نظر آتا تھا، مجھے بھی وہ بیمار معلوم ہوتی تھی اور لوگ تو کہتے ہی تھے کہ وہ بیمار رہتی ہے۔ پھر بھی وہ مجھے بہت پسند تھی، ہم دونوں لوگوں کے ڈھور اسی قبرستان کی طرف چلے آتے تھے اور یہیں ملتے تھے، بہت دیر تک بیٹھتے، پھر میں اُس سے رخصت ہو کر شہر کی طرف چلا جاتا اور وہ گاؤں واپس جاتی۔ میں شہر اس لئے جاتا تھا کہ اس کے ساتھ واپس ہوتے کوئی دیکھ نہ لے۔ اسی طرح مہینوں اور برسوں گزر گئے، اسکی شادی ہو گئی، میرا کون تھا کہ شادی کی فکر کرتا، میں نے شادی ہی نہیں کی۔ سائرہ کی شادی اُس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی، ایک ظالم، بدعقل اور بدصورت آدمی کے ساتھ۔ میری بددعاؤں اور سائرہ کی آہوں کے اثر سے اب وہ زندہ نہیں، نہیں تو میں تمہیں دکھاتا۔ سائرہ سُسرال سے خوش نہ تھی اور کئی دفعہ جب اس پر سختیاں ہوئیں تو وہ سُسرال سے بھاگ آئی۔ مجھے یہ کبھی نہ بھولیگا کہ وہ تھکی ہوئی اور کمزور واپس آتی، مجھ سے اپنا حال کہہ کے مدد چاہتی اور مجھ سے ملکر اپنا دُکھ درد بھول جاتی"۔

اس درمیان میں سلیم کئی جگہ اُسے ٹوک کر کچھ پوچھنا چاہتا، کچھ معلوم کرنا چاہتا، شاید اُس کے دل میں بھی اپنی محبت کی کہانی کہہ دینے کی اُمنگ پیدا ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس کے خیال کے مطابق وہ زیادہ رنگین اور دلکش تھی لیکن کہنے کی ہمت وہ اپنے اندر نہ پاتا تھا قبرستان کے اونچے نیچے درختوں میں تیز سنسناتی ہوئی ہوا، غریبوں کی زندگی کی طرح بے اساس، ہوا کے جھونکے کے ساتھ اُڑتے ہوئے خشک اور بے رنگ پتے، ہولناک حد تک فضا کو بے کیف بنا رہے تھے، تیسرے پہر کی جھلسی ہوئی گرمی میں محبت ہی کی کہانی کہی اور سنی جا سکتی تھی یا پھر قبر بنائی جا سکتی تھی اور مُردے دفن کئے جا سکتے تھے کیونکہ قبر کھودنے والوں کو قبر کھودے بغیر چارہ نہیں اور مرنے والے وقت کی پابندی نہیں کرتے۔ سلیم کے ہونٹ کئی بار کچھ کہنے کے لئے تھرائے اور رہ گئے۔ علی بخش گرمی اور تکلیف کے ہر احساس سے بے پروا اپنی محبت کی داستان سنا دینا چاہتا تھا۔

"میں اُسے تسکین دیتا لیکن وہ میرے تسلی کے لفظوں کو ایک طرح کا دھوکہ سمجھتی کیونکہ وہ دوسرے کی ہو چکی تھی اور اُس سے یہ کہنا کہ صبر کرے اُسے دھوکے میں رکھنے کے سوا اور کیا تھا۔ میں نے تم سے بتایا یا نہیں کہ سائرہ بیمار رہا کرتی تھی۔ ہاں یاد آیا، ابھی بتا چکا ہوں، اُسے "بڑی بیماری" معلوم ہوتی تھی۔ زرد چہرے میں بخار کی ہلکی سی آنچ سے کچھ سرخی کبھی کبھی دکھائی دے جاتی اور میرا جی چاہتا کہ اُسے دیکھا کروں لیکن اُس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہوتی چلی جاتی تھی اور وہ خود بھی جینے سے بیزار معلوم ہوتی تھی جب وہ اپنی سسرال جاتی تو میں کسی نہ کسی بہانے سے وہاں ضرور پہونچ جاتا اور اُسے دیکھ آتا، ہر دفعہ کوئی نیا بہانہ تلاش کرتا۔ چھوٹے چھوٹے بہت سے قصے ہیں جو مجھے کبھی نہ بھولیں گے کیونکہ میری اُجاڑ اور سنسان لمبی زندگی میں بس یہی یاد رکھنے کے لائق باتیں ہیں انھیں بھی بھلا دوں تو پھر کیا یاد رکھوں۔ ایک دفعہ جب سائرہ اپنے گھر آئی تو اس کا باپ بہت بیمار تھا۔ گاؤں والوں سے اُس سے بالکل نہ بنتی تھی کیونکہ اپنی بدمزاجی کی وجہ سے وہ سب سے لڑتا رہتا تھا۔ ایک میں تھا کہ اُس کے یہاں آیا جایا کرتا تھا، سائرہ کا باپ مرتے وقت مجھ سے کہہ گیا تھا کہ سائرہ بیمار رہتی ہے میں کبھی کبھی اس کی دیکھ بھال کر لیا کروں گھر میں ایک بوڑھی ماں کے سوا اور کوئی نہیں تھا، معلوم نہیں مرنے والے کی آخری بات کا اثر تھا یا کوئی اور بات کریں جو کچھ کہا تا

سب سائرہ کے علاج میں لگا دیتا اب سائرہ تندرست ہوتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ اس کے شوہر نے کوئی اور عورت رکھ لی تھی اسلئے اُسے سائرہ کی پروا بھی نہ تھی، وہ یہیں اپنے مکان میں رہتی۔ جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس سال بھی اسی سال کی طرح شہر میں بہت سخت ہیضہ پھیلا ہوا تھا، ہر روز بہت سے آدمی مرتے"۔ علی بخش کو دقت کا احساس نہ تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ کبھی نہ رُکے گا لیکن وہ یہیں تک پہونچا تھا کہ میدان کو پار کر کے مرنے والے کے عزیزوں کے رونے اور جنازہ کے ساتھ آنے والوں کے منہ سے نکلے ہوئے کلمۂ شہادت کی آواز سُنائی دی۔ سلیم اور علی بخش دونوں نے اُدھر دیکھا۔ اُن کا پسینہ خشک ہو چکا تھا اور وہ کام کرنے کے لئے پھر تازہ دم ہو گئے تھے۔ علی بخش واپس ہونے کے لئے مُڑا لیکن سلیم پوری کہانی سُن لینا چاہتا تھا، اُس نے علی بخش سے کہا: "ہاں تو پھر کیا ہوا؟"۔ علی بخش نے چلتے ہوئے کہا

"ہوا کیا! اُسی سال سائرہ بھی ہیضہ میں بیمار ہو کر مر گئی، یہ اُسی کی قبر ہے جو میں تمھیں دکھانے لایا تھا۔ میں کبھی کبھی یہاں آتا ہوں"۔ ایک لمحہ کے لئے وہ رُکا اور ایک درد انگیز مسکراہٹ چہرے پر پیدا کر کے بولا: "سلیم! اور تمھیں یہ بات عجیب طرح کی معلوم ہوگی کہ سائرہ کی قبر بھی میں نے ہی کھودی اور انھیں ہاتھوں سے"۔ یہ کہتے کہتے دونوں پھر نئی قبر کے پاس پہونچکر اپنے کام میں لگ گئے۔ سلیم نے ٹھنڈی سانس لی، اُسے اپنی محبت، ہیضہ کا زور اور اپنی یا اپنی محبوبہ کی موت کا خیال آنے لگا۔ آنے والوں کے قدموں کی چاپ اچھی طرح سنائی دینے لگی۔ لا الہ الا اللہ کی آواز زیادہ زور سے گونجنے لگی۔ مجمع میں سے ایک شخص بہت تیز چل کر آگے نکل آیا شاید وہ یہی کہنے آرہا تھا کہ قبر جلد طیار کرو۔

احتشام حسین رضوی

تحفۃً پیش کیا ہے ادارۂ نگار لکھنؤ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مطبوعات طاقِ بستاں

بہترین انتقادی لٹریچر

خواب کی دُنیا: خواب کی دنیا کی وسعت پر پہنچئے تو بیداری کی دنیا سے زیادہ ہے لیکن ہم کو اسوقت تک یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ اسکی نوعیت کیا ہے، حقیقت کا علم کجا؟ ہر زمانہ اور ہر ملک میں لوگوں نے کوشش کی کہ خواب کیونکر نظر آتے ہیں، انکی علمی اور نفسیاتی یا روحانی توجیہہ کیا ہو سکتی ہے اور تعبیر کوئی معنی رکھتی ہے یا نہیں، چنانچہ انھیں سوچنے والوں میں سے ایک شخص سگمنڈ فرائیڈ بھی تھا اس نے اپنی ساری عمر اسی تحقیق میں بسر کر دی اور آخر عمر میں ایک کتاب لکھ کر خود بھی اس خواب کی دنیا میں چلا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اگر آپ کو اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمایئے جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرائیڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے۔

قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ (۱۰۰)

الہامات شاد: شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن اگر آپ انکے کلام کا انتخاب مع ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمایئے۔ قیمت علاوہ محصول ۸ر

اقبال کی شاعری: یہ کتاب بھی مولانا عبدالمالک کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اقبال پر اُردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ اسکی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔

قیمت علاوہ محصول ۱۰ر

اُردو زبان کا ایک اور رسم الخط

مارچ کے نگار میں جناب محمود علی خاں صاحب بھوپالی کا رسم الخط نظر سے گزرا۔ حقیقتاً موصوف نے بڑی محنت و کاوش کی ہے۔ لیکن ابھی اس میں خامیاں ہیں۔

اِس سے قبل ایک رسم الخط سید جواد احمد صاحب زیدی لیکچرار پولس کالج مراد آباد نے ۱۹۳۸ء میں ایجاد کیا تھا جو خانصاحب کے رسم الخط سے زیادہ آسان، عمدہ اور بڑی حد تک خامیوں سے پاک معلوم ہوتا ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں چالیس حروف اور آٹھ اعراب ہیں اور حرفوں کے موجودہ رسم الخط میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ۔ سید صاحب کا رسم الخط یہ ہے:

ا ا	بہ ب	پہ پ	تا ت	ٹا ٹ	ثا ث	ج ج	چ چ
ح ح	خ خ	د د	ڈ ڈ	ذ ذ	ر ر	ڑ ڑ	ز ز
ژ ژ	س س	ش ش	ص ص	ض ض	ط ط	ظ ظ	ع ع
غ غ	ف ف	ق ق	ک ک	گ گ	ل ل	م م	ن ن
و و	ہ ہ	ر - ی ر - ی	زاید حروف	ۃ تائے تانیث	ں نون غنہ	ھ ہائے مخلوط	ے یائے معکوس
اعراب	زبر ـَ	زیر ـِ	پیش ـُ	فوقانی ـٰ	تحتانی ـٖ	محاذی ـٓ	تشدید مد ـّ ـٓ
دیگر علامات	وقف ـْ	وقف کامل .	"وقفین" ؛	ندا !	استفہام ؟	خط —	واصل ـ

ہدایات:- ۱؎ کل حروف کی اونچائی یکساں ہونا چاہئے بجز حرف ب، ح، خ کے جن میں نقطہ کا حصہ معینہ لمبائی سے باہر ہو۔

۲؎ چوڑائی کل حروف کی عموماً لمبائی سے کچھ کم ہو۔

۳؎ اعراب کی لمبائی و چوڑائی حروف کی لمبائی و چوڑائی سے نصف ہو۔

خانصاحب کا رسم الخط :-

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض

ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و

سید صاحب کے رسم خط میں چالیس حروف ہیں اور آٹھ اعراب۔ ان سے ٹائپ : آسانی بن جائے گا مگر خانصاحب نے اعراب ایک جگہ نہیں دکھائے ہیں۔ انھوں نے ۴۴ حروف تہجی اور اعراب حرفوں ہی میں شامل کر دئے ہیں مثلاً لہ (الف زبر) لہ (الف زیر) لہ (الف پیش) اس سے حروف سہ چند ہو گئے۔ اس کے علاوہ بلا اعراب کے ۴۴ حروف ہیں اور یہ سب ملکر ۱۶۸ حروف ہو گئے۔ پھر اکبات یہ بھی ہے کہ خانصاحب کے حروف زیادہ جگہ گھیریں گے۔ کیونکہ وہ عمودی ہیں۔ جو مضمون اُن کا چار سطر میں آئے گا وہ سید صاحب کے رسم خط میں تین سطر کے اندر آجائے گا۔

خانصاحب نے اپنے یہاں تشدید کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ حالانکہ تشدید سے عبارت مختصر ہو جاتی ہے مثلاً جنت میں صرف تین حرف ہیں۔ مگر خانصاحب نے چار بتائے ہیں، اس طرح : جلہ نہ تہ۔ سید صاحب کے یہاں تشدید کی وجہ سے ایک حرف کم ہو جاتا ہے جیسے : ج ے ن ت

ہجے کا یہ قاعدہ غلط ہے کہ اعراب آخر میں بولے جائیں۔ مثلاً۔ "اب" کے ہجے یوں کئے جاتے ہیں (الف، بے زبر اب) لیکن ہونا یوں چاہئے (الف زبر بے، اَب) اس سے فایدہ یہ ہے کہ ہجے میں کبھی غلطی نہیں ہو سکتی اور آسان بھی ہے۔ سید صاحب نے اس ضرورت کو بھی مدنظر رکھا ہے۔

لفظ کے ہجے کرنے میں اعراب جن حرف پر ہے وہ اسی حرف کے بعد لکھا جانا چاہئے۔ حروف ساکن کے لئے کسی اعراب کی ضرورت نہیں۔

اس رسم الخط کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں مثل انگریزی کے فضل ہے۔ جس سے خط خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ دیگر علامات یعنی وقف۔ وقف کامل۔ ندا۔ استفہام وغیرہ بھی شامل کئے ہیں۔ جس کی وجہ سے عبارت کا مطلب صاف سمجھ میں آسکتا ہے اور غلط پڑھنے کا بالکل امکان نہیں رہتا۔

خانصاحب کے رسم الخط میں ایک غلطی یہ ہے کہ اس میں ابجد کے قاعدہ سے تاریخ نکالنے میں بہت بڑی غلطی ہو جاتی ہے۔ مثلاً اردوے معلیٰ میں "ی" کے ۱۰ عدد نہیں آتے۔

"ا ب ج د ہ و ز ح ط ا" (یعنی اُردوئے معلّٰے)

لیکن سید صاحب کے حروف مجبہ ہیں۔ جس سے ابجد کے حساب میں غلطی نہیں ہو سکتی۔

"ا ب ج د ہ و ز ح ط ی"

سید صاحب نے اضافت کی بھی ضرورت سمجھی۔ جس کی وجہ سے "کے۔ کا۔ کی" کو کم کر دیا ہے۔ اور اُس کے لئے (ـ) خط مقرر کیا۔ لیکن خانصاحب کے یہاں اضافت نہیں ہے۔

خانصاحب نے کھینچے ہوئے زیر اور پیش کے لئے کوئی علامت ہی مقرر نہیں کی۔ جس کا خود حضرت نیاز کو اعتراض ہے لیکن سید صاحب نے اس خامی کو بھی دور کر دیا۔

کو ـــ ک ۃ ۹ ـــ کُو ـــ ک ۃ ۹ ـــ وغیرہ۔

خانصاحب کے بعض بعض حروف آسان کی جگہ مشکل ہو گئے ہیں۔ مثلاً "ا" (ی) "ا" (ک) وغیرہ جسکو حضرت نیاز نے بھی لکھا ہے کہ یہ ٹیڑھی کھیر ہے۔ لیکن سید صاحب کے یہاں ایسی ٹیڑھی کھیر کوئی نہیں ہے۔

کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

زبر: ا ـ لہا (اب) - ا ـ لہاس (ابر) - س ـ ر ـ ا (را) - س ـ ر ـ ا ـ ں (راس - س ـ ر ـ ا ـ ں (راست)

ن ـ ۹ (نو) - ن ـ ۹ م (نوم) - م ـ ے (مے) - م ـ ے ـ ل (میل) - چ ـ م ـ ن (چمن) - ل ـ ر ـ ج ـ ہ (درجہ) - ف ـ ۹ ر ـ ا ـ ے (فوراً) - ک ـ ہ ـ ا (کہا) - ک ـ ھ ـ ا (کھا) - ٹ ـ ھ ـ ن ـ ڈ ـ ھ ـ ا (ٹھنڈھا)

زیر: ا ـ ں (اس) - ا ـ س م (اسم) - ل ـ ے (دے) - ل ـ ے ـ گ (دیگ) - ک ـ ۃ (کی) - ک ـ ۃ ل (کیل) - ل ـ ۃ ـ ا (لیا) - ک ـ ے ـ ۹ ں (کیوں) - م ـ ے ـ ۃ (مٹی) - س ـ ا ـ ے ـ ل (سائل) - د ـ ۃ ـ ڈ ـ ہ (دیدہ) - ن ـ ا ـ ھ ـ ے (تھے) - ب ـ ھ ـ ا ـ ک ـ ھ (بھیکھ) - چ ـ ۃ ـ ۹ ں ـ ن ـ ۃ (چیونٹی)

پیش: ا ـ ن ـ ا (اُن) - ا ـ ن ـ ں (اُنس) - گ ـ ۹ (گو) - گ ـ ۹ ـ س (گوش) - گ ـ ۹ ـ س ـ ن ـ ا (گوشت) - د ـ ۹ ـ ع ـ ا (دُعا) - خ ـ ے ـ ر ـ ۹ (خیر) - پ ـ ڑ ـ ھ ـ ۹ (پڑھو)

فوقانی: ا ـ ع ـ ل ـ ۃ (اعلیٰ) - ظ ـ ہ ـ ر (ظہر) - س ـ ر ـ خ ـ م ـ ن (رحمٰن) - ص ـ ل ـ ۹ ـ ۃ (صلوٰۃ)

تحتانی: پ ـ ڑ ـ ع ـ ے ـ ن ـ ا ـ ہ (بعینہٖ) - ف ـ ا ـ ۃ (فی) - ن ـ ا ـ ف ـ ں ـ ہ ـ ۃ (نفسہٖ)

محاذی : خ ا و (خو)۔ خ ا و ل ا (خوب)۔ ہ ا و ں (ہوں)۔ ل ا ے ع د ہ ا (بعدہٗ)۔

ر ے ا و ن ا (رُوٹ)۔ ل ا ھ ا و ل (پھول)۔ د ا و د ھ ۰ (دودھ)۔

تشدید : ج ے ن ا ا ے ن ا (جنّت)۔ م ے ح ے ر ا ے س (محرّر)۔ ل ا ے ح ے م ا و ل (تحمّل)۔

ل ا ے چ ا ہ (بچّہ)۔ گ ے چ ھ ا ے ا ۔ (گُچّا)۔

مد : آ ج (آج)۔ آ م ے د (آمد)۔ م ے آ ل (مآل)۔ آ ر ے ا و ن ا ہ (آئینہ)۔ آ ٹ ھ (آٹھ)

متفرقات : خ ا و ے آ ل ا (خواب)۔ خ ا و ش (خوش)۔ ک ے ل ا ۔ ا و ر ے ا و ت (شب و روز)۔

د ے ا م ے ن ا ۔ ے (دامن)۔ ف ا ے ل ے ک (فلک)۔ م ے ہ ر (مہر)۔ م ے ہ ے ۔ ے ن ا ے و (مہنو)۔

ج ے ل ا و ہ ۔ ک ش ے ح ے ر (جلوۂ سحر)۔ ل ا ے د ر ا و ل ح ے ش ے ن ا (بدرالحسن)۔ ق ا ے م ر (قمر)

ل ا ے د ر ا و ل د ی ن ا (بدرالدین)۔ ک ی ے آ (کیا) "استفہامیہ"۔ ش ے آ م ا (سوامی)۔

ل ا ر ے م (پریم)۔ چ ھ ہ ۰ (چھہ)۔

حضرت نیاز فرماتے ہیں کہ صوتی حروف میں سے ایک حرف لیا جائے مثلاً جیسے ا۔ ع میں سے ا۔ ش۔ س۔ ص میں سے س وغیرہ۔ مگر ایسا ٹائپ صرف اُردو ہی کے لئے بن سکتا ہے لیکن وہ بھی نامکمل ۔۔۔ امل اور عمل یا اسرار اور اصرار کو مثال کے طور پر لیجئے اور اُن کو ایک ہی لکھا جائے تو املے میں بہت غلطی ہوگی۔ لیکن سید صاحب کا رسم الخط عربی، فارسی کے کل الفاظ کے لئے ہے جبمیں الفاظ کا املا و تلفظ نہایت صحت کے ساتھ ہوتا ہے ۔۔۔ اس کے علاوہ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جیسا حضرت نیاز نے تحریر فرمایا ہے کہ یہی رسم الخط لکھنے اور ٹائپ میں کام دے تو ایسا ہونا مشکل ہے۔ یہ حروف مطبع اور ٹائپ ہی استعمال ہو سکتے ہیں۔

میری رائے میں یہ خط بہت آسان اور عمدہ ہے ارباب ذوق سے عرض ہے کہ وہ اپنی رائے ظاہر کریں کہ خانصاحب کا رسم الخط زیادہ مفید ہوگا یا سید صاحب کا۔

عبدالواحد خاں واحد

مکتوبات نیاز

آپ نے بھی کس کا ذکر کیا — اُن کا کیا ہے
وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں
مجھے بتایئے میں کیا کروں ——— میں ؟
کرا در د ہر پنداری وطن نیست !

بہر حال اگر کامیابی کی صورت وہی ہے، جو آپ نے بیان کی تو انا للہ ! ، لیکن اگر کوئی اور طریقہ ممکن ہو تو لکھئے اور لکھنا کیا — اُسے اختیار کیجئے اور انجام تک پہونچایئے

دُردانہ کے میاں یہاں آئے تھے، ماشاء اللہ کیا کہنا !

تو گوئی کہ برخود بہ پیچد ہمی

وہ "تن پُھن" ، وہ "چوچلے" کہ کیا حیدر جان اور کالکا دین میں ہوں گے، خدا کی شان ہے کہ فطرت یہ ، اور قسمت وہ !

آپ بھی عجیب شخص ہیں - میں کہتا ہوں آپ نے انتخاب صحیح نہیں کیا، آپ فرماتے ہیں، دیکھا جائے گا، میں عرض کرتا ہوں کہ یہ کام اُن کے بس کا نہیں، آپ کہتے ہیں

یک مے نر آبگینہ و ساغر بر آورم !

بہتر ہے . آپ وہی کیجئے جو نہ کرنا چاہئے، لیکن اخیر میں مجھ پر الزام نہ رکھے گا، سوئی کا کام آپ بھالے سے لینا چاہتے ہیں، تو لیجئے، لیکن اپنی ذمہ داری پر

آپ کی بخششیں تو بارہا دیکھی ہیں،
"پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے" —— میری طرف سے تو آپ کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی سبب برہم ہوجانیکا ملا اور آپ نے اسے ٹالدیا، لیکن اب آپ کی "خوئے عفو و درگزر" میں کیوں یہ تبدیلی ہوگئی، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی — یعنی "بے سبب آزار" تو میں آپ کو کہہ نہیں سکتا، لیکن "آبروئے محبت" کی طرف سے جو بے اعتمادی دل میں پیدا ہو رہی ہے، اس پر اپنے تئیں ملامت کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے — پھر ایسی

صورت میں "ساقی کوثر" کا فتویٰ کیا ہونا چاہیے، اسے آپ ہی سمجھئے اور آپ ہی بتائیے!

کچھ دنوں سے اک نیا وہم دل میں یہ پیدا ہو رہا ہے کہ "دامن یار" کی وسعت تو وہی ہے، لیکن اپنی گرفت ہی کچھ ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ سچ بتائیے، برہمی کی یہی وجہ تو نہیں؟

ہر چند یہ جانتا ہوں کہ اگر آپ نے بھی اس کی تصدیق کر دی تو سوائے زہر کھا لینے کے اور کوئی چارہ نہیں لیکن خدا جانے کیوں اس بات کا بھی یقین ہے کہ آپ جھوٹ بول کر میری جان بچالیں گے۔ آہ،

دل و صد آرزوئے خام بہ دل
یار و چندیں فریب دمن تنہا!

بندہ نواز، اگر شاعری وہی ہے جو آپ کے دوست کرتے ہیں تو
لرزتا ہے مرا دل، زحمتِ مہر درخشاں پر!

یعنی اُن سے زیادہ مجھے آپ پر رحم آتا ہے

ایک مہمل گو شاعر کی سب سے بڑی جائے پناہ "تصوف" ہے، لیکن اس غریب کے کلام میں یہ بھی نہیں۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ لکھوں تو کیا لکھوں۔ آپ کی ہر خواہش میرے لئے فرمان سہی، لیکن "امتثال امر" کا تعلق انسان کے "تاب و تواں" سے بھی تو ہے اور جب یہی جواب دیدے تو کوئی کیا کر سکتا ہے

میری رائے میں تمام مسودہ کو دریا برد کیجئے اور اُن سے کہئے کہ دُنیا میں "غیر شاعر" رہکر جینا "شاعر" رہکر جینے سے زیادہ پُر لطف ہے۔ یہ اُن سے کس نے کہدیا کہ "عاشق" ہونے کے لئے شعر کہنا ضروری ہے اور اگر "عاشق" بننے کے لئے ضروری ہو تو کم از کم "وصل محبوب" کے لئے تو یقیناً ضروری نہیں۔ پھر جب اصل مدعا بغیر ان جھگڑوں کے حاصل ہو سکتا ہے تو وہ کیوں اپنا دامن اس خار زار میں اُلجھاتے ہیں۔ "چین کی بنسی بجانے" کا نام شاعری نہیں ہے!

مکرمی

مری امید کے دھندلے ستارے منجمد کیوں ہیں
تصادم سے ہوئی ہے جب عروس کہکشاں پیدا

یہ شعر جناب (بقول آپ کے) کتنے ہی بڑے "علامۂ دہر" اور "اُستاد العصر" کا ہو، لیکن ہے بالکل مہمل اول تو انجماد اور منجمد دونوں غلط لفظ ہیں، عربی میں اس مادہ سے انفعال کے وزن پر اشتقاق دیکھا نہیں گیا، لیکن اگر اسے صرف اس لئے صحیح سمجھ لیا جائے کہ اُردو میں رائج ہو گیا ہے۔ تو معنے اس کے وہی ہیں جو لفظ جامد کے ہیں، یعنی جمی ہوئی، یا غیر متحرک چیز

پہلے مصرعہ میں شاعر "امید" کے دھندلے ستاروں کے منجمد ہو جانے پر حیرت یا طعن کرتا ہے۔ اول تو

دھندلے کا لفظ بالکل بیکار ہے اور یہاں کوئی معنی نہیں دیتا۔ دوسرے یہ کہ ستارے جامد و مشتعل دونوں حالتوں میں ساکن نہیں ہیں بلکہ گردش کر رہے ہیں۔ اس لئے شاعر نے جس معنے میں منجمد کا لفظ استعمال کیا ہے وہ صحیح نہیں لیکن اگر ان تمام مہملات کو صحیح فرض کر لیا جائے تو بھی دوسرے مصرعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں، کیونکہ اس میں پہلے مصرعہ سے زیادہ مہمل دعویٰ کیا گیا ہے

کہکشاں کے وجود کو سیاروں کے تصادم کا نتیجہ سمجھنا انتہائی کم فہمی ہے۔ کہکشاں تو ستاروں کے جھرمٹ یا اجتماع کا نتیجہ ہے نہ کہ تصادم کا! سیاروں کا تصادم تخریب ہے نہ کہ تعمیر، اس لئے یہ شعر لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے بالکل بے معنی ہے۔ اگر اس شعر کو یوں کہا جائے

کشش کیا ہو گئی میری تمنا کے ستاروں کی
تجاذب ہی سے ہے حسنِ عروسِ کہکشاں پیدا

تو تعبیر کی غلطی بیشک دور ہو جائے گی، لیکن کوئی خاص بات پھر بھی پیدا نہ ہوگی

ناصح مشفق ، پندنامہ کا شکریہ۔ لیکن اس کے حقیقی احترام کے لئے "عطار و سنائی" کہاں سے پیدا کروں!

ماشاءاللہ، کیا کیا باتیں پیدا کی ہیں اور نجات کی کیسی عجیب و غریب راہیں دکھائی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تو بتائیے کہ ان باتوں کے سمجھنے کے لئے آپ کا سا دماغ کہاں سے لاؤں؟

پہلے کامل چوتھائی صدی تک شام کو دعائے "گنج العرش" اور صبح کو "دلایل الخیرات" کا ورد کر لوں تو آپ کی ہمسری کا دعویٰ کروں، لیکن اتنی عمر اب کہاں؟

اگر کوئی اور آسان ترکیب دماغ خالی کرنے کی آپ کو معلوم ہو تو وہ بتائیے۔ کوئی تعویذ۔ کوئی گنڈا ـــــ کوئی فلیتہ ـــــ!

آپ لوگ تو ادنیٰ توجہ سے انسان کی صورت و شکل بھی بدل دیتے ہیں، احمق بنا دینا کیا مشکل ہے ـــــ باور کیجئے، میں خود اس عقل سے بہت بیزار ہوں بارے، اب آپ کی تحریر سے کچھ امید ہوئی ہے، شاید سودا اچھا ہو جائے!

ٹوٹی دریا کی کلائی زلف اُلجھی بام میں،
مورچہ مخمل میں دیکھا آدمی بادام میں!

اگر آپ نے خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ نہیں دیا تو کوئی جواب نہیں دیا جائیگا

مذہب اور قناعت

ایک مدت سے قناعت ہماری زندگی کا اہم ترین اُصول بنی ہوئی ہے، فلسفی سے لیکر شاعر تک سب ہم کو قناعت ہی کا درس دیتے آئے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر اس پر نکتہ چینی کی جائے تو اسے کفر و الحاد سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن چونکہ مذہب دُنیا میں آخری سانسیں لے رہا ہے اور اس کا فتوائے کفر و الحاد ایک ایسی ضرب کی حیثیت رکھتی ہے جو خود اس کے کلّہ پر پڑتی ہے اس لئے ہم کو چاہئے کہ مذہب کے دیگر احکام کے ساتھ ساتھ فلسفۂ قناعت کو بھی معقولات کی کسوٹی پر کسیں اور دیکھیں کہ آیا اس دور میں (جبکہ ہمارے توہمات، اعتقادات، اخلاقیات اور روایات اپنا فرسودہ چولا بدل رہے ہیں) قناعت کی کہاں تک گنجایش ہے۔

مسائل زندگی کے کسی پہلو پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ اہم اُصول کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ ہمارا وجود ہی تنازع للبقا کے اُصول پر قایم ہے چہ جائیکہ ہماری ترقیاں کہ وہ تو بغیر جد و جہد کے حاصل ہو ہی نہیں سکتیں۔ اگر سماج کے کسی فرقہ کی ذہنیت فرسودہ، رجعت پسند ہو تو وہ ہرگز دنیا کی ترقی میں معاون نہیں ہو سکتی اور نہ ایسا فرقہ مہذب کہا جا سکتا ہے۔ اسلئے اگر ہماری زندگی میں رجعت پسندانہ خیال پایا جاتا ہے تو ہم کو چاہئے کہ اس سے جلد از جلد اپنا پیچھا چھڑالیں۔

فلسفۂ قناعت کیا ہے؟ قناعت کی کوئی جامع تعریف نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ مختلف زمانوں میں اس کے مختلف معنے ہو سکتے ہیں۔ قناعت کا خیال مسئلہ تقدیر سے وابستہ ہے۔ دنیاوی امور میں انسان کا تقدیر پر بھروسہ کر لینا اور اپنی کم مائگی پر مطمئن ہو جانا قناعت ہے۔ قناعت کا نفاذ بھی بیحد دلچسپ ہے، یعنی ایک شہنشاہ جس کے قبضہ میں بیشمار خزانے ہیں اور ایک مزدور جو دو روز سے بھوکا ہے دونوں کو اس کا درس دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی قسمت پر شاکر رہیں، یعنی ایک بادشاہ اپنی ضروریات سے بہت زیادہ حاصل کرنے کے بعد قانع ہو جائے اور مزدور اپنی ضروریات پوری نہ کر سکنے پر قناعت کرے۔ اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ مذہب یہ کب کہتا ہے کہ انسان فکر معاش نہ کرے اور تدبیر سے غافل ہو جائے خاصکر اسلام تو یہ سکھاتا ہے کہ تدبیر اور فکر معاش عین عبادت ہے۔ لیکن معترضین کے یہ دلایل بے حقیقت ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ اسلام اور دیگر مذاہب ایسی ہی تعلیم دیتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مزدور نے معاش کی کوشش نہیں کی؟ کیا اس نے دن میں ۱۶ گھنٹے کام نہیں کیا؟ اور کیا وہ اس قلیل آمدنی میں اپنے عیال کی پرورش کر سکتا ہے۔ شہنشاہ بغیر محنت کے کثیر سرمایہ کا مالک بن بیٹھا کیونکہ وہ ایک شہنشاہ کا بیٹا تھا اور مزدور ۱۶ گھنٹے کام کرنے کے بعد بھی دو وقت نہیں کھا سکتا۔ اب قناعت کا نفاذ کس پر ہونا چاہئے، شہنشاہ پر یا مزدور پر؟ اخلاقیات میں یہ گنجایش کہاں کہ شہنشاہ پر اُصول قناعت کا نفاذ کرے، کیونکہ اخلاقیات خود ہی ایک ایسے طبقہ کی کارفرمائی ہے جو سیاسی و اقتصادی طاقت کا مالک ہونے کی وجہ

سے دوسروں کو محتاج بناکر خود امیر بن جاتا ہے۔

قناعت، تقدیر، اخلاقیات اور مذہب ان سب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بغیر مذہب اور اخلاقیات کے قناعت ایک بے جان شے ہے۔ یعنی قناعت پر کوئی عمل نہ کرے اگر مذہب اور اخلاقیات اس کی پشت پر نہ ہوں، لیکن ایسا کیوں ہو اس کا بیان بھی خالی از لطف نہیں۔

غریب کو اپنی حالت پر خوش رکھنے کے لئے ضرورت ہے ایک ایسے نظام کی، ایک ایسی ذہنیت کی، جس کے ذریعہ سے انسان کی جدوجہد کو ختم کیا جاسکے اور مذہب و اخلاق اس کے بہترین ذریعہ ہیں، کیونکہ انسان کے دماغ اور اسکی ذہنیت پر روحانیت اور مذہب کا خیال اس طرح چھا جاتا ہے کہ اُس کی ذہنی طاقت سلب ہوجاتی ہے اور مذہب کے قایم کئے ہوئے قوانین اور اخلاقیات کے بنائے ہوئے اُصول کے خلاف کہنا یا کرنا غیر ممکن ہوجاتا ہے۔

ابھی تک قناعت کے پاس فلسفہ تھا اس پر عمل کے ذرایع نہ تھے۔ اب یہ بھی ممکن ہوگئے۔ اعتقادات، توہمات، اور تعصبات کے تیر و تفنگ سے آراستہ ہوکر فلسفۂ قناعت انسانی ذہن، عقل اور اس کی طبعی طاقت پر حملے شروع کردیتا ہے اور چونکہ مذہب اور اخلاقیات نہ صرف اس تشدد کو روا رکھتے ہیں بلکہ اپنے بچاؤ کا بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں، اس لئے انسان بہت جلد اس کا شکار ہوجاتا ہے۔

سقراط کے زمانہ میں مذہبی اخلاقیات کے اندر تغیر شروع ہوا۔ فلسفۂ اخلاق کا موجد خود سقراط نہیں بلکہ اس کا شاگرد افلاطون تھا جس نے اس کے نظریہ سے ایک نیا فلسفہ "اخلاقی نظام" پیدا کیا۔ یہی نظرئے نصرانی دینیات کا بیش خیمہ تھے، ہندوستان میں فلسفۂ اخلاق کی تخلیق مذہب سے علٰحدہ نہ تھی۔ منو کی سمرتی اور سمتھا ایک حد تک اخلاقیات سے بحث کرتی ہیں۔ لیکن ان شاستروں میں بھی اخلاق کی تعلیم مذہبی پنڈتوں نے دی۔ اسلام نے بھی اخلاق کو مذہب سے علٰحدہ نہیں کیا۔ چنانچہ قناعت ایک مذہبی اُصول بن گیا۔

اب ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ سماج میں فلسفۂ قناعت کا تاریخی پس منظر کیا ہے۔ سماج کی ابتدا اسوقت ہوتی ہے جب انسان زمین میں بیج بونا سیکھتا ہے اور زرخیز مقامات پر بس کر اجتماعی طور پر کاشت شروع کرتا ہے۔ یہ ایک قدیمی اشتمالی سماج کا ڈھانچہ تھا۔ لیکن اَن گڈھ وزار بن جانے کے بعد زمین کی ملکیت انفرادی ہوجاتی ہے اور پیداوار کا طریقہ بھی نفع گیری کے اُصول پر قایم ہوجاتا ہے۔ آپس کے تصادم خیز تعلقات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے بہانہ سے اخلاقیات سماج میں داخل ہوکر فرقوں اور افراد کے درمیان ایک وسیع خلیج حایل کردیتا ہے۔ جسمانی قوت، مکر و فریب، اور قدرت کی تبدیلیوں (مثلاً بارش اور حرارت) کی وجہ سے ایک فرقہ دوسرے فرقہ سے زیادہ مضبوط ہوجاتا ہے۔ چونکہ اخلاقیات کا قایم کرنے والا وہی ہوتا ہے جس کے پاس اقتصادی اور سیاسی قوت ہو اور جو سب کو اپنے قایم کئے ہوئے اُصول منوا سکے اس لئے یہ مضبوط اور مالدار فرقہ سماج میں اپنے حسب دلخواہ اخلاق غصب کردیتا ہے۔ ایسے اخلاقیات میں مذہبی جواز کی شمول ضروری ہے تاکہ اس اختراع کے خلاف بغاوت نہ ہوسکے۔ اقتصادی اور جسمانی کمزوری دیگر انسانوں کو اس کا موقع نہیں دیتی اور وہ اس اختراع کے خلاف بغاوت کرسکیں۔ رفتہ رفتہ یہ اخلاقیات سماج کا جزو ہوجاتے ہیں۔ پشتہا پشت گزر جانے کے بعد سماج کے افراد اخلاقیات کو فطری سمجھنے لگتے ہیں۔ اُدھر مذہب بھی اخلاقیات کو اپنا جزو سمجھ لیتا ہے اور کیوں نہ سمجھے جبکہ

اقتصادی طاقت کا مالک ہی دونوں کا بنانے والا ہے۔ الغرض قناعت، اخلاقیات و مذہب کی ایک کڑی ہے۔

ہر زمانے کے روایات، اخلاقیات، فلسفہ اور ادب اپنے دور کے اقتصادی نظام اور سماج کے ذہنی ارتقا کو ظاہر کرتے ہیں۔ افراد کے خیالات اپنے ماحول سے تشکیل پاتے ہیں۔ چنانچہ دو سو برس قبل کا فلسفہ، ادب، اور اخلاق آج سے بہت مختلف ہے۔ مذہبی اور اخلاقی کتابیں بھی اپنے زمانہ کے اقتصادی نظام کو ظاہر کرتی ہیں چنانچہ تمام مذہبی ادب مثلاً وید، شاستر، سمرتی، انجیل، قرآن، حدیث وغیرہ اپنے زمانۂ تصنیف کی آئینہ دار ہیں ان کا درس بھی وہی ہوگا، جو اس زمانہ کی سماج نے موقع کے لحاظ سے مناسب سمجھا ہو۔ ان میں ہندو مذہب قدیم ترین ہے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ آریہ قوم ہندوستان کے قدیم باشندوں کو جسمانی غلام بنا چکی تھی۔ آریوں کے آنے کے بعد ہی ہندوستان میں ملکیت کی ابتدا ہوئی جس کا اصول کسان کو بیدخل کر دینا اور زمین کا خود مالک بن جانا تھا۔ ہندوستان میں آقا کی حیثیت سے رہنے کے لئے ضرورت تھی کہ یہاں کے قدیم باشندوں سے محنت لی جاتی اور ان کو ایسے اصولوں کا پابند بنا دیا جاتا جس کے خلاف بغاوت کرنا وہ کفر سمجھتے۔ چنانچہ نیابت الٰہی کے سایہ میں ایک مذہب کی بنیاد پڑی۔ منو کے قوانین اسی جبروت کو قایم رکھنے کے لئے بنائے گئے تھے۔ یہ قوانین انسان کے حقوق نہیں بلکہ فرایض بتاتے ہیں۔ اور ان کا فلسفہ لفظ "دھرم" میں پنہاں ہے۔ دھرم کا اول اصول قناعت بتایا گیا ہے۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ منو کے قوانین بننے کے وقت سماج کی کیا حالت تھی۔ امیر اور فارغ البال فرقوں کو (جو آریہ قوم تھی) قناعت کا سبق دینا قطعاً بے سود تھا۔ ہاں بھوکے اور ننگے فرقے (دراوڑ۔ گوڑ۔ بھیل اور سنتھال وغیرہ) فطرتاً غیر قانع ہوں گے اور ان کو قناعت کا سبق دینا کس قدر اخلاق سے بعید اور سراسر ظلم ہوگا۔ لیکن ان کی یہ فطرت (غیر قانع ہونا) آریہ قوم نقصان کا باعث تھی جو کہ موجودہ نظام کو برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ قناعت ہی کے ذریعے اس قدیم قوم کو غلام کی حیثیت سے رکھا جا سکتا تھا اور امیروں کی میراث قایم رہ سکتی تھی۔ امیروں نے اس اصول پر عمل کر کے غریبوں کے سامنے ایک مثال قایم کر دی اور انھیں سمجھایا کہ خوفناک اور قہار دیوتاؤں کو اسی سے خوش کیا جا سکتا ہے۔ انسان کی غریبی اور امیری تو دیوتاؤں کے ہاتھ میں ہے اور دیوتا قناعت کے اصول پر عمل کرنے والوں کو اس کا اجر دیتے ہیں اور امیر بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ امیروں کے لئے اصولِ قناعت تو ایک دلبستگی کا سامان تھا اور غریبوں کے لئے سخت ترین مصائب کا حضرت عیسیٰ کا یہ ارشاد بھی کہ "اگر تمھارے گال پر کوئی ایک طمانچہ رسید کرے تو تم دوسرا گال پیش کر دو" قناعت کے اصول پر مبنی ہے۔ عیسائیت میں بھی قناعت کو ایک اہم جگہ دی گئی ہے۔ اگر تمام یورپ عیسائیت کے فلسفۂ قناعت پر عمل کرتا تو آج وہ نہ اس قدر متمدن ہوتا، نہ ذہنی ترقی کر سکتا، یہ سب کچھ قناعت سے لاپروائی اور سائنس پر کاربند ہونے کی بدولت ہے۔ اسلام نے قناعت کا سبق اس زور شور سے نہیں دیا کیونکہ اس کی پیدائش ہی ایسے اوقات میں ہوئی جبکہ جاگیری نظام کے کھنڈر پر ایک نیا نظام طیار ہو رہا تھا۔ لیکن فلسفۂ قناعت اسلام میں جس قدر مذہب سے بغلگیر ہے کسی اور مذہب میں نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے مذہب اور اخلاقیات کو علٰحدہ نہیں کیا بلکہ اخلاقیات خود مذہب کا ایک جزو ہے۔

اس فلسفہ کا اثر قوم اور ملک پر یہ ہوا کہ ایک کثیر تعداد نے درویشوں اور سادھوؤں کا مشرب اختیار کر لیا۔ گبن اپنی تاریخ میں لکھتا ہے "قدیم عیسائی درویش اپنے بربری اشتیاق کے زیر اثر انسان کو ایک مجرم اور خدا کو قہار ثابت کرتے پھرتے تھے۔ بھیک مانگ کر وہ بہت معمولی غذا کھاتے۔ گوشت اور شراب کی ممانعت تھی۔ وہ شادی نہیں کرتے تھے۔ جسم اور دماغ

کو مختلف قسم کی حرکات سے مجروح کرتے اور محبت، خوش مزاقی اور آرام وغیرہ سے دور بھاگتے تھے۔ خانقاہیں بڑھ رہی تھیں ہزاروں آدمی دنیا چھوڑ کر درویشی اختیار کر رہے تھے۔ وہ اپنی ملکیت چھوڑ کر گھروں سے بھاگ جاتے۔ بہت جلد دنیا والوں نے ان کی عزت کرنا شروع کر دی۔ جس سے یونانی فلسفہ عمل کو سخت نقصان پہونچا" یہ بلا صرف عیسائیت سے نہیں شروع ہوئی تھی بلکہ اس سے قبل فیثاغورث نے خاموشی کے ذریعہ سے عقل اور شعور حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسٹوئک، جسمانی تکلیف اور روحانی موت کو فلسفی کی خوبیاں سمجھتے تھے۔ عیسائیت سے کئی سو برس قبل یہودی پیغمبروں نے درویشی اختیار کی۔ جان ان کا آخری نمایندہ تھا جو تارک الدنیا ہوگیا۔ مصر میں ایک جاہل دیہاتی انتھنی نامی نے اسے فروغ دیا۔ غریب مصری کسان بہت جلد انتھنی کے پیرو ہوگئے۔ اس کا اثر لیبیا اور دریائے نیل کے شمالی حصہ پر بھی پڑا۔ یہاں پکومئیس نے ایک زبردست خانقاہ قایم کی جس میں ڈیڑھ ہزار درویش رہتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ایسی نو خانقاہیں بن گئیں اور مصری مرد اور عورتوں کی ایک کثیر تعداد تارک الدنیا ہوگئی۔ بقول روفینس مصر کی نصف آبادی گھروں سے بھاگ گئی۔ مصر کی دیکھا دیکھی روم میں بھی خانقاہوں کی دنیا آباد ہونے لگی۔ امراء اور بیگمات نے اپنے محلات کو خانقاہوں میں تبدیل کر دیا۔ دنیاوی مزے لینے کے بعد ان کو اس مسخرہ پن میں بیحد لطف آیا اور خوبصورت عورتیں خانقاہوں کی محور ہوگئیں۔ جس وقت روم میں انتھنی کے شاگردوں کا زور تھا۔ شام میں حلیرن کے مداحوں نے درویشی کی تنظیم شروع کی۔ دنیا جو کبھی افلاطون کے افکار اور ارسطو کی علمیت سے مستفید ہو چکی تھی اب ان جاہلوں کے پیروں پر لوٹ رہی تھی۔ بحر اسود کے کنارے اور ایشیائے کوچک میں باسل نے فرانس اور برطانیہ میں سینٹ مارٹن اور گالک سینٹ نے، اور آئرلینڈ میں سینٹ کولمبا نے فقیری کو منظم کیا۔ مختصر یہ کہ پانچویں صدی میں برطانیہ سے لیکر حبش تک اور ہسپانیہ سے لیکر فارس تک لاکھوں مرد اور عورتیں درویشی کی بلا میں مبتلا ہو چکے تھے۔ چین کی دیوار عظیم کے بننے کے سلسلے میں تقریباً ۲۵ فیصدی مزدور درکار ہوئے جس کا اثر یہ ہوا کہ سماج میں کار آمد پیداوار نہ ہو سکی اور ایک زبردست قحط پڑ گیا۔ یہی وقت تھا جب بدھ مذہب کی خانقاہیت چین میں رائج ہوئی۔ ہزاروں قحط کے مارے اور مفلوک الحال چینی "نروان" حاصل کرنے کی غرض سے پہاڑوں سے کود پڑتے تھے۔ اسلام میں بھی تصوف کا وجود اسی ذہنی خرابی کی وجہ سے ہوا اور سیکڑوں آدمی صوفی ہوگئے۔ ہندوستان میں درویشی گوتم بدھ کے زمانہ سے رائج ہوئی اور ہندو مذہب کے دوبارہ طاقت میں آجانے کے بعد بھی جاری رہی۔ شنکراچاریہ بدھ مذہب کا سخت مخالف تھا لیکن سنیاس کے موافق تھا۔ بدھ بھکشو اپگپت جب راجہ اشوک سے ملنے آیا تو اس کے ہمراہ اٹھارہ ہزار بھکشو تھے۔ اشوک نے گیارہ لاکھ اشرفیاں انھیں تقسیم کیں۔ اس کے ایک ہزار سال بعد راجہ ہرش کے عہد میں پریاگ کے مشہور میلہ میں بھکشوؤں اور سادھوؤں کی تعداد پہلے سے بھی زیادہ بڑھ چکی تھی۔ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد تیاگ لے چکی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مگدھ دیش میں انسان اپنی عمر کا بہترین حصہ تیاگ میں کاٹتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے معمولی حملہ کے سامنے بہار اور بنگال نہ ٹھہر سکے۔

فلسفہ قناعت کا یہ اثر لازمی تھا۔ انسان کی فطرت ہے کہ جلتے ہوئے مکان سے بھاگ نکلے۔ جس سے سماج میں غریبی ہو اور ساتھ ہی ساتھ توہمات اور تباہ کن اعتقادات کا بھوت سوار ہو تو ایک معمولی انسان بجائے سماج کی حالت درست کرنے اور فرسودہ نظام کو بدلنے کے لئے تارک الدنیا ہو جانا زیادہ آسان سمجھتا ہے۔ یہی اسوقت بھی ہوا۔ غربت اور تعصبات

کے بھونچال سے انسان تلملا اُٹھا لیکن مجبور تھا، تمام طاقتیں اس سے سلب ہوچکی تھیں اور وہ اپنا ذہنی توازن کھوچکا تھا دماغی کمزوری کی وجہ سے اس کو آخرت میں دودھ اور شہد کی نہریں نظر آنے لگیں اور وہ دنیا کو چھوڑ کر عقبیٰ کا خواب دیکھنے لگا۔

فلسفۂ قناعت کا اثر خیالات، اخلاق، تمدن اور دنیا کی ترقی پر کیا ہوا؟ اس فلسفہ نے انسان کے خیالات پر مہریں لگا دیں۔ اس کا ذہن زنگ آلود ہوگیا۔ خیالات میں وسعت اسی وقت آئے گی جب انسان توہمات، اعتقادات اور تعصبات سے قطع نظر محض استدلالی اور معقولی طریقہ پر مسایل زندگی کا تجزیہ کرے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ دنیا میں ہر امر کسی طاقت کے ماتحت ہوتا ہے، جس پر انسان کی قدرت نہیں، تو ایسی حالت میں خیالات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ الگر اسباب وعلل معلوم کرنے کے بجائے انسان ہر مسئلہ غیب کو سونپ دے تو انسانی کوشش کو سخت صدمہ پہونچے گا۔ کیونکہ اس سے انسان میں بے عملی پیدا ہوگی جو انسان کی موت ہے۔ ایک مشہور مثل ہے "فکر سے فاقہ بہتر" یہ فلسفہ جس قوم کا ہوگا وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتی، یہ فلسفہ تو ایسے انسان کا ہے جس کے قویٰ جواب دے چکے ہوں یا وہ جنون کی آخری منزل پر ہو۔

جب خیالات فرسودہ اور رجعت پسند ہوں گے تو سماج کا اخلاق بھی رجعت پسندی کی طرف مایل ہوگا۔ اخلاق اپنے عہد کے ذہنی، اقتصادی اور سماجی ارتقا کا ایک آئینہ ہے۔ چنانچہ جس سماج میں غلامی کا رواج تھا اخلاق نے بھی اسکو جایز سمجھا۔ یہی نہیں بلکہ خود اخلاق نے غلاموں کو قناعت، ایثار اور کسرنفسی کا درس دیا۔ روم میں جب غلامی کا دور دورہ تھا اخلاقیات نے بھی غلاموں کو بنی نوع انسان کے پست ترین درجہ میں جگہ دی۔ روم کے اخلاقی قوانین میں غلام کو شہری آزادی نہیں دی گئی تھی۔ ان کے بچے بھی غلام اور اپنے مالکوں کی ملکیت ہوتے تھے۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام میں اخلاق اعلیٰ طبقہ کی ایک استبدادی مشین ہے جس کے ذریعہ وہ عوام کی آزاد خیالی اور طباعی پر پہرہ بٹھا دیتا ہے اس دور میں غریب اپنی غربت کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ امیر سے کچھ رعایتوں کا متمنی نظر آتا ہے۔ ایسے نظام میں جہاں دولت کی تقسیم اس قدر غیر متناسب ہو افراد کے اخلاق گر جاتے ہیں۔ چونکہ فلسفۂ قناعت ان کو موجودہ نظام کے درہم برہم کرنے سے روکتا ہے اس لئے پیٹ پالنے اور تن ڈھکنے کے لئے وہ مجبور ہوکر مخرب اخلاق پیشے اختیار کرتا ہے گداگری اور عصمت فروشی ایک زندہ مثال ہے۔ چونکہ اپنے ماحول پر انسان کو قابو نہیں ہے اس لئے یہ ایک لازمی امر ہے کہ وہ حصول معاش کے لئے ایسے ہی طریقے اختیار کرے گا۔

یہ سچ ہے کہ تہذیب و تمدن کسی ایک فرد یا فرقہ کا نہیں بلکہ اجتماعی ہوتا ہے لیکن تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب اور تمدن ہمیشہ سماج کا اعلیٰ طبقہ ہی بناتا ہے اور دوسروں طبقوں پر ان کا نفاذ کردیتا ہے۔ اعلیٰ طبقہ کی حیثیت مثل ایک اقلیت کے ہے، لیکن اقتصادی اور سیاسی طاقت کا مالک ہونے کی وجہ سے اس کے قبضہ میں ایسے وسایل ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں سے اپنا تمدن منوا سکے۔ تمدن سماج کی اجتماعی ملکیت ہوجانے کے بعد بیحد سرعت سے ترقی کرتا ہے اور عوام میں پہونچکر اپنی اصل صورت تبدیل کردیتا ہے۔ اعلیٰ طبقہ کو یہ کب گوارا ہے کہ تمدن ان کی میراث سے باہر ہوجائے۔ چنانچہ وہ اس کے تحفظ کے لئے تشدد کا حربہ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً سائنس کے نئے نئے ایجادات

تمدن کا نتیجہ ہیں جو اپنی افادیت کی وجہ سے عام پسند ہو جاتے ہیں اور ہر شخص ان سے مستفید ہونا چاہتا ہے۔ عوام کی یہ بڑھتی ہوئی مانگ اعلیٰ طبقہ کو پسند نہیں۔ وہ قوانین بنا دیتا ہے کہ سائنس کی ایجادات کی رجسٹری ہوا کرے تاکہ ہر کس و ناکس اُن سے آگاہ نہ ہو سکے۔ یہ ہے تمدن کی حفاظت۔ ہمارے روزمرہ کے استعمال کی تمام اشیاء تمدن کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہم فلسفۂ قناعت پر عمل کریں تو ہماری ضروریات بہت کم رہ جائیں گی اور تمدن کی ترقی رک جائے گی۔ قدیم ہندوستان بلکہ آجکل کا فلسفہ بھی "سادہ زندگی اور اعلیٰ خیالی" ہے، چنانچہ چرخہ اور کھادی، اسی رجعت پسند فلسفہ کا نتیجہ ہیں۔

دُنیا کی ترقی محض صنعت و حرفت، تجارت اور سرمایہ داری ہی نہیں ہے۔ اس کا راز اعلیٰ خیالی، آزادی، اجتماعی زندگی، دولت کی مناسب تقسیم، شہری آزادی، سائنٹفک خیالات کی افزایش اور افراد کی طبعی طاقت کی توسیع کے بے شمار ذرایع میں مضمر ہے اور قناعت کا اُصول ان سب کے لئے پیام اجل ہے۔ قناعت کا اُصول خاصکر اس صدی میں بیکار ہے کیونکہ سماج کے نشو و نما کے بعد افراد ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ ہو گئے ہیں کہ بغیر ایک کی مدد کے دوسرا کام نہیں کر سکتا ہماری ضروریات اس قدر وسیع ہو گئی ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ پھر اگر تمام انسان قناعت کے اُصول پر کاربند ہو جائیں تو دنیا کی کیا حالت ہوگی۔ نہ اناج پیدا ہوگا نہ مال بنے گا۔ لوگ جنگلی پھلوں پر گزارا کریں گے، اور پتّوں سے بدن ڈھانکیں گے ترقی کے تمام راستے مسدود ہو جائیں گے، ذہنی افکار مفقود ہو جائیں گے اور کچھ عرصہ بعد دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔

انسان کے ہاتھ میں بہت بڑی طاقت ہے۔ اس کا وجود ہی قدرت کے خلاف مسلسل کشمکش کا نتیجہ ہے۔ ذہنی اور جسمانی قوت کے علاوہ اس میں قوت عمل ہے جو اس کو ادنیٰ جانداروں سے ممیز کرتی ہے۔ اگر انسانی ذہن پر تعصب، توہم اور رجعت پسند ماحول کا اثر نہ ہو اور اس کی طبعی طاقتوں کو بڑھنے دیا جائے تو انسان دنیا بنا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے ماحول اور بیرونی طاقتوں سے اثر پذیر ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس کو اپنے موافق بھی بنا سکتا ہے، دنیا کا نظام بھی بدل سکتا ہے

علی امام ام-اے

نگار کے پچھلے پرچے

۱۹۲۶ء: جنوری ۸ر - ۱۹۲۷ء: اگست ۸ر - ۱۹۲۸ء: مئی ۸ر - جون ۸ر - ۱۹۲۹ء: مئی ۱۲ر - ۱۹۳۱ء: جولائی تا دسمبر ۸ر فی پرچہ - ۱۹۳۲ء: جنوری ۱۲ر، فروری، مارچ، مئی، جون، جولائی، ستمبر، نومبر ۸ر فی پرچہ - دسمبر ۸ر - ۱۹۳۳ء: فروری ۸ر ۱۹۳۴ء: فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۸ر فی پرچہ - ۱۹۳۶ء: دسمبر ۱۲ر - ۱۹۳۷ء: فروری، مارچ ۱۲ر فی پرچہ - اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ر فی پرچہ، ستمبر، اکتوبر، دسمبر ۱۲ر فی پرچہ - ۱۹۳۸ء: فروری، اپریل تا دسمبر ۴ر فی پرچہ - ۱۹۳۹ء: فروری تا جولائی ۴ر فی پرچہ - اکتوبر و نومبر ۸ر فی پرچہ - ۱۹۴۰ء: فروری ۴ر - مارچ ۶ر - اپریل ۴ر - مئی ۶ر - جون ۸ر - ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۴ر فی پرچہ -

منیجر نگار لکھنؤ

(بقیہ مضمون صفحہ ۸)

گر کے اُٹھتا ہوں تو آجاتی ہے طاقت پاؤں میں اک نیا رستہ نکل آتا ہے ہر اُفتادے سے

دُنیا میں ہر سوچنے والے کے لئے غم کا سامان بہت موجود ہے۔ لیکن شاد صاحب اُسے قنوطی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے۔ اور یہی دنیا کے مصائب سے نہ گھبرانے والی فطرت اُن کی شاعری سے ظاہر ہے۔ زندگی کو وہ باوجود تمام تکلیفوں کے "ہنسی خوشی" گزارنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی ایسا ہی کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

محبت میں قسمت کا رونا نہ رو حماقت جتانے سے کیا فائدہ
جنون جدائی میں کپڑے نہ پھاڑ تماشہ دکھانے سے کیا فائدہ

وہ ناکامی پر اپنی کوششیں ختم نہیں کرتے بلکہ اور زور و شور کے ساتھ کوشش کی تجدید کرتے ہیں اور جب بخواہ نتیجہ کا یقین رکھتے ہیں۔

ہر سعی مستقل ہے نتیجہ لئے ہوئے کوشش میں پختگی ہو تو منزل کدھر نہیں

مسرت بخشتی ہے انتہائے تلخکامی بھی شراب تلخ آخر انگبیں معلوم ہوتی ہے

منزل مقصود کی ضامن ہے سعی مستقل چاہئے اے شاد ہمت پر بھروسہ چاہئے

اپنی حالت کے بدلنے پر اگر آجائے کوئی مشکل نہیں انسان بدل سکتا ہے

غم کا ساتھی کوئی نہیں، غم کی گھڑیاں ہنسکر ٹال

جھک کے ساحل پہ رُکنے والوں کو دلمیں اتنا تو سوچنا تھا جو کود جاتا ہے بحرِ ذخار میں وہ موتی بھی رولتا ہے

خانقاہ زہد[1] سے جاتا ہوں سوئے میکدہ شاد رندوں میں سواں قدر و قیمت تو نہیں

اخلاقیات کی دنیا میں آجکل جو انقلاب برپا ہے، اس شعر کی بنیاد اسی پر قایم ہے۔

نیند اُس کی بھی رات بھر نہ ہوئی[2] خیر۔ فریاد بے اثر نہ ہوئی

کیوں سنورتے ہو یہ سوال نہیں، یہ عنایت غریب پر نہ ہوئی[3]

ہر دوا کارگر بتاتی ہے[4] مجھ سے تو ہیں چارہ گر نہ ہوئی

دل لرزتا ہے کانپتے ہیں قدم ختم شاید وہ رہگذر نہ ہوئی

یاد نے اُس کی وہی دلپہ ستم ڈھائے نا[5] شاد ہم حرکت ملاقات سے پچھتائے نا[6]

---

[1] لفظ زہد بیکار ہے اور صرف مصرعہ پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔ [2] جس مفہوم کو شاعر ظاہر کرنا چاہتا ہے وہ اس مصرعہ سے ظاہر نہیں ہوتا۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ "آنکھ اس کی بھی رات بھر نہ لگی" یا "اُس کو بھی رات بھر نہ آئی نیند" لیکن مطلع بنانے کی فکر نے محاورہ کی غلطی کی طرف توجہ نہ کرنے دی [3] شعر کا مفہوم بہت مبہم ہے۔ [4] ناقص انداز بیان ہے۔ [5] بہت پاکیزہ شعر ہے۔

اب بھی کی میں نے وہ صحرائے محبت سے گریز ٹھوکریں کھا کے تو انسان سنبھل جائے ہے
اب نگاہوں میں وہ شوخی ہے نہ احساسِ حجاب آپ محفل سے اُٹھا کر مجھے پچھتائے ہے

ان اشعار کی نثر نہیں ہو سکتی۔

نہ یہ خبط ہے نہ جنون ہے نہ یہ فال ہے نہ سگون ہے مرے پاس تم ہو سکون ہو تم اُٹھے کہ دردِ نہاں اُٹھا
تری کج روی ہو کہ بے رُخی مری بے کسی ہو کہ بے بسی، کوئی جیسے کہتا ہو بیٹھ ابھی تری بزم سے میں جہاں اُٹھا

یہ مانا وہ نہیں ہیں ہم پر جلوے تو ہیں اُن کے جہاں اک شکل دیکھی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

بات جتنی لطیف اور ناقابلِ اظہار ہوتی ہے شاد اتنی ہی زیادہ خوبصورتی اور تکمیل کے ساتھ اُسے ادا کرتے ہیں۔ شاد صاحب کے یہاں اس قسم اشعار بہت ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

جو ہے یہ تو ہر نگہ التفات بے معنی نہیں۔ تو حسن نوازش کی انتہا بھی نہیں

یہ اُسی قسم کی لطیف بات ہے کہ محسوس تو ہو سکتی ہے لیکن بیان نہیں کی جا سکتی۔

روح میں تلاطم ہے پاؤں ڈگمگاتے ہیں آپ خود سمجھ لیں گے ہم جہاں سے آتے ہیں
اک اور شخص سے لکھوا رہا ہوں خط شوق تمھیں کہو کہ مرا حالِ زار کیا ہو گا

اس سے بہتر طور پر حالِ زار کا بیان نہیں ہو سکتا۔

ہاں یونہیں برقِ جمالِ یار اپنا کام کر دیکھنے والے جلا کرتے ہیں۔ جلنا چاہئے

غالب کے کلام کا پہلو دار ہونا جو لوگوں کو مرغوب ہے اُس کا اصلی سبب یہی ہے کہ وہ اصلیت کو اپنے اشعار سے جانے نہیں دیتا۔ یہی چیز شاد صاحب کے اس شعر میں ہے "جلنے" کے دونوں مفہوم پر غور کیجئے اور "دیکھنے والوں" کی تفریق بھی ساتھ ہی ساتھ کیجئے تو اس شعر کا اصلی لطف آئے گا۔

طور پر جلوہ دکھایا بتکدے میں مل مجھے مدعا یہ ہے کہیں تسکین ہو حاصل مجھے

یہ حقیقت ہے کہ مذاہب کا مصرف انسان کی اپنی "تسکین" کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے گو یہ تسکین ہی شاید سب کچھ ہے۔ اس شعر میں بڑی خوبی کے ساتھ دنیا میں مذہب کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ میں اس شعر کو شاد صاحب کے بلند ترین اشعار میں گنتا ہوں۔

چاہتا ہوں اور نہیں پاتا سکون آرزو ڈھونڈھتا ہوں اور نہیں ملتا نشاطِ دل مجھے
مسکرا کر اُس نے کیا دیکھا قیامت آ گئی کھائے لیتی ہے نگاہوں میں بھری محفل مجھے
شاد وہ پردے میں ہے لیکن تصور کے طفیل صاف آتا ہے نظر اُس بت کا اک اک تل مجھے
قریب اپنے بُلایا بھی کچھ کہا بھی نہیں، مجھے عزیز بھی رکھتا ہے جانتا بھی نہیں

لہ شعر بہت اچھا ہے، لیکن دوسرے مصرعہ میں کھا کے کی جگہ کھاتے ہونا چاہئے۔ ۲ہ پہلے مصرعہ میں لفظ احساس بالکل بے محل استعمال ہوا ہے، لیکن شعر بہت اچھا ہے۔ ۳ہ بجائے تو کے ہے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ۴ہ نہایت خوب ہے۔ ۵ہ شعر پاکیزہ ہے لیکن بجائے حسن کے اگر اُسکی یا اُنکی ہوتا تو تھوڑا سا تصنع بھی دور ہو جاتا

تعلقات کی احباب کو ہوا بھی نہیں — وہ میرے پاس نہیں ہے مگر جُدا بھی نہیں
کبھی یہ طرزِ تکلم کہ ہم تمہارے ہیں — کبھی یہ شانِ تبسم کہ واسطا بھی نہیں
زمانہ اپنی نظر بازیوں کو کیا جانے — وہ سامنے نظر آتا ہے سامنا بھی نہیں
جو ہے یہ تو ہر نگہ التفات بے معنی — نہیں - تو حسن نوازش کی انتہا بھی نہیں
یہ احتیاط تعلق کہ جاننے والے — یہ جانتے ہیں کہ وہ مجھکو جانتا بھی نہیں
مری نگاہ کے لپکے پہ بس نہیں میرا — یہ چاہئے تھا کہ میں اس کو دیکھتا بھی نہیں
نئی بیاض طلب کی گئی ہے مجھ سے شادؔ — یہ طرزِ پرسشِ احوال کچھ بُرا بھی نہیں

ان اشعار کا ایک خاص لہجہ ہے جسے شاعر کی شخصیت کا نچوڑ کہہ سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو شادؔ صاحب یا اُن کی شاعری سے واقف ہیں وہ اس "لہجے" کو ہر جگہ پہچان لیں گے۔ شادؔ کی غزل خود چغلی کھاتی ہے کہ یہ شادؔ کے علاوہ کسی کی نہیں یہی صاحب طرز کی شان ہے۔

چمن کے پھولوں سے عشق رکھنے کا بزدلی ہی نہیں تعلق — اگر چمن کو مری ضرورت پڑی تو میں جاں نثار بھی ہوں

لوگوں کا خیال ہے کہ حُسن و عشق کے مشغلے دنیا کی تلخ اور ٹھوس حقیقتوں سے گریز کرنے کے طریقے ہیں۔ ڈاکٹر اقبالؔ مرحوم نے اس خیال کا اکثر اظہار فرمایا ہے کہ "بزم" کا وقت "رزم" کے بعد آتا ہے یعنی جب تمام دشواریاں جھیل کر اور اپنے ہزاروں افراد کا خون بہا کر قوم اپنی بنیاد دنیا میں اُستوار کر لیتی ہے جب "تفریح" یا "عیش" کا موقع آتا ہے۔ اور اُسوقت حسن و عشق کے مشغلے اُسے زیب دیتے ہیں۔ شادؔ صاحب کا خیال ہے کہ انسان اپنی اوقات کے لحاظ سے رزم و بزم دونوں میں موقع اور وقت کے بموجب حصہ لے سکتا ہے۔ اُنھوں نے صرف کلام ہی نہیں عمل سے بھی اکثر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاعر بھی اور انسانوں کی طرح اس دنیا کا انسان ہے، وہ بھی سوچتا ہے سمجھتا ہے، محسوس کرتا ہے اور عمل کرتا ہے۔ شاعر کا کام معشوق کی اداؤں کو نظم کرنا ہی نہیں ہے۔ اُسے دنیا کے کاروبار میں عملی طور پر حصہ لینا بھی ہے چنانچہ دنیا کے کاروبار کا اگر تقاضا ہوا تو شاعر اپنی جان تک دے سکتا ہے۔ شادؔ صاحب نے اپنی زیادہ تر نظموں کی بنیاد انھیں ناقابلِ انکار حقیقتوں پر رکھی ہے۔ اور شادؔ صاحب کی نئی غزلیں بھی اس قسم کی ہوتی ہیں جن میں جذبات کا تعلق تو عمل کی دنیا سے ہوتا ہے لیکن زبان اور طریقِ اظہار نہایت لطیف اور غزل کے شایانِ شان ہوتا ہے۔ مثلاً

یہ مجھپہ آزادیوں کی بنیاد رکھنے والوں کو کیا ہوا ہے — اُنھیں تو پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ میں استوار بھی ہوں

رواج ایسے کہ جن میں تبدیلیوں کا اقدام نامناسب — سماج کی ہوشیاریوں میں شریک ہے عقل کا خلل بھی

گردوں بگڑا، اپنے بگڑے، قسمت بگڑی، صحت بگڑی — اُس پر بھی ہم نے دنیا کے جو کام سنوارے کیا کم ہیں،
ہر معبد میں جب اُسکی تجلی اپنے درشن دیتی ہے — تقدیس حریم کعبہ سے مندر کے دوارے کیا کم ہیں

ہاتھ شمشیر پہ چہروں پہ غمِ آزادی — ہم کو یارانِ وطن دیکھ کے حیراں ہونگے
تو بُرے وقت سے واقف ہی نہیں اے صیاد — خار کیا پھول بھی پیوستِ رگِ جاں ہونگے

لمبی زمینوں کی غزلیں:

مجھی سے تاکید ضبط اُلفت مجھی سے فرمایش غزل بھی
یہ وہ مثل ہے کہ پھول شاخوں سے توڑ کانٹوں سے بچکے چل بھی

کمال سنجیدگی سے کر بات پھیرے آنکھ رُخ بدل بھی[1]
مگر محبت کے بعد رسوائیوں کا قانون ہے اٹل بھی

شب جدائی میں صبح تک دلپہ کیا گزرتی ہے کچھ نہ پوچھو
اگر نہ کہنے لگوں میں اشعار چین پاؤں نہ ایک پل بھی

وہ اس سے پہلے بھی پاسبانوں کے خوف سے خط نہ بھیجتا تھا
جو اُس سے پہلے گزر چکی ہے وہی مصیبت ہے آجکل بھی

رسوائی کا کھٹکا ہے تو کیوں پاس آئیں کیوں بات کریں
بیمار الم کی پرسش کو آنکھوں کے اشارے کیا کم ہیں

ہم گھر سے نکل کر وحشت میں صحرا کی جانب کیوں جائیں
چننے کو یہ تنکے کیا کم ہیں گننے کو یہ تارے کیا کم ہیں

وہ میری اُلفت کو جانچتا ہے وہ میری ہمت کو تولتا ہے
تو پھر نہیں زیر لب تبسم کے سات پردوں میں بولتا ہے

مرے علاوہ کسی سے بھی انجمن میں اُلفت نہیں ہے اسکو
مرے علاوہ وہ انجمن میں سبھی سے ہنستا ہے بولتا ہے

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:

جزاک اللہ اے عزم صمیم ناز برداری
وہی جیتا یہاں جس شخص نے ہمت نہیں ہاری

مری آنکھوں پہ رکھکر ہاتھ اسنے چھپ سا دھنے والے
ترا ہر ناز دل آویز تیری ہر ادا پیاری

کہنے سے اپنے زانو پہ سر رکھدیا تو کیا
بہتر تھی اس سے آپ کی ٹھوکر۔ کہے بغیر

غزل کی شاعری میں شاد کی کیا پوزیشن ہے اور یہ کہ انھوں نے کس طرح پرانی روش سے انحراف کیا ہے اُس کو بخوبی سمجھنے کے لئے اُن کی نظم "تادیب" پڑھنی بہت ضروری ہے۔ چونکہ انکے کلام کا کوئی مجموعہ شایع نہیں ہوا لہذا وہ نظم ذیل میں لکھتا ہوں:

کچھ تدبر چاہیئے اے شاعر ہم شکل خضر
وقت نے تجھ سے اُٹھالیں عمر کی پابندیاں

اپنے اعصابی تعطل سے نہیں تو باخبر
دیکھ آئینہ کبھی اے شاعر شیریں زباں

ضبط موسیقی مگر پائے تلفظ مضمحل
کانپتے لب۔ ہانپتے نغمے۔ تنفس۔ ہچکیاں

صورت معنیٰ کی بے ربطی سے بزم شعر میں
تیرے بوڑھے منہ مہاسوں پر ہزاروں پھبتیاں

رعشہ براندام لیکن وصل جاناں کی ہوس
جھرّیاں چہرے پہ دل مُردہ تمنائیں جواں

نوجوانوں سے کہیں بڑھکر تجھے سودا کے زلف
آستیں ٹکڑے۔ گریباں چاک دامن دھجیاں

وسعت دشت جنوں پر در تری وحشت کو تنگ
سبزۂ خودرو سے تجھکو گھر پہ صحرا کا گماں

جادۂ منزل سے وارستہ نظر آتا ہے تو
ذلت قطع منازل اتباع کارواں

جس کے دامن تک پہونچنے کو ہوا تو گرد راہ
تیری جانب سے چلا جاتا ہے وہ دامن کشاں

تجھکو خاطر میں نہیں لاتا کوئی کافر نظر
تیرے نالے پست ہمت تیری آہیں ناتواں،

بزم دلبر تک رسائی ہے نہ آسایش نصیب
پاسباں تیرے مخالف تیرا دشمن آسماں،

تیرے سجدوں کا تواتر باعث سوہان عقل،
گھستے گھستے گھس گیا اُس بت کا سنگ آستاں

[1] یہاں بھی ردیف کا استعمال بے محل ہوا ہے۔

تیرا وہ محبوب جو سارے زمانے کا محب
جس کے کوچے میں عدو ہیں کارواں در کارواں

تیرا وہ مطلوب جو عیاریوں میں اپنی فرد
جس نے رہنے کے لئے "دکھرا" بنایا ہے مکاں

مہ جبیں کی آڑ میں چنگیز خاں سے تجھکو عشق
"آستیں میں دشنہ خفتہ"[1] ہاتھ میں تیر و کماں

ناک میں دم تیرے ہمسایوں کا تیرے شور سے
تجھکو بستر پر اگر ڈھونڈو نہیں ملتا نشاں

جب قفس میں آب و دانہ کھینچ لاتا ہے تجھے
توڑ لیتا ہے تڑپ کر تو قفس کی تیلیاں

دخت رز کو منہ لگانا کیا کبھی دیکھی نہیں
پھر بھی حاصل تجھکو فخر بیعتِ پیر مغاں

تیرا ہر مضمون ہلکا تیرا ہر دعویٰ سبک
اور ایک ایک شعر میزانِ حقیقت پر گراں

اب بھی تیرے پائے استقلال کو جنبش نہیں
اب بھی اُس بستی میں ہی تھا سو برس پہلے جہاں

اب بھی تجھکو ریگ پر ہوتا ہے صحرا کا خیال
اب بھی موجوں پر تجھے ہوتا ہے ساحل کا گماں

اب بناوٹ سے نہیں تہذیبِ حاضر ملتفت
جہل سے منسوب ہیں اب یہ ملمع سازیاں

اب جہازوں کے لئے طوفان اک ہلکی سی لہر
اب دُخانی کشتیاں بے خوف موجزن پر رواں

پھر بھی تو ٹوٹے سفینوں پر ہے سرگرم ستیز
جس میں قطرے سے نہیں خالی سوال بادباں

الحذر اے ذالّ[2] میدان تغزل الحذر
الاماں اے شہسوارِ رہزہ سازی الاماں

شاد صاحب کی شاعری کا امتیازی وصف جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا یہی ہے کہ اُن کی شاعری اُن کی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ اگر ایک بدمعاش اپنے کو بدمعاش ظاہر کرے تو اس پر سننے والوں کو خفا ہونے کی اصلا ضرورت نہیں لیکن اگر ایک معقول آدمی خود کو نامعقول بتائے تو یہ اُس کی شاعری کی نامعقولیت ہے۔ میں جگر مرادآبادی کو ایک کامیاب شاعر خیال کرتا تھا کیونکہ اکثر وہ اپنی حیثیت کے مطابق گفتگو کرتے یا شعر کہتے ہیں اور اپنے کلام میں اپنی ہی آئینہ داری عام طور پر کرتے ہیں۔ لیکن ایک مرتبہ الہ آباد کی کسی صحبت میں جہاں موصوف بھی تشریف فرما تھے، جوش ملیح آبادی کی شاعری کا ذکر چھڑ گیا۔ ہر شخص اپنی اپنی قابلیت کے بموجب اُنھیں گالی دے رہا تھا۔ جب خود جگر صاحب اُنکے متعلق اپنی رائے دیتے معلوم ہوئے تو میں اپنے گمنام گوشے سے کھسکا اور اُنکے پاس آگیا تاکہ ایک ایک حرف سُن سکوں۔ لیکن جب "غیر شاعرانہ" کراہت کے ساتھ جگر نے جوش کو "بینڈ ماسٹر" کا لقب دیا اُس نے میری کیا حالت کردی، اب کیا عرض کروں۔ میں جگر اور اُردو شاعری پر افسوس کرتا ہوا اپنی جگہ پر آگیا اور ابتک یہی دعا کرتا ہوں کہ خدا کرے میرے کانوں نے غلطی کی ہو۔ شاد صاحب کی غزلگوئی اسی "منافقت" کے خلاف جہاد ہے، شروع شروع اُن پر بھی پُرانا رنگ چڑھا رہا لیکن چونکہ طبیعت سلجھی ہوئی پائی ہے جلد سنبھل گئے اور پھر اس طرح سنبھلے کہ اپنے تین مکمل دیوان نذرِ آتش کرکے دم لیا۔ سب سے بڑی خصوصیت اس نئی دور کے غزل گوئی کی اُس کا "آپ بیتی" ہونا ہے اس معاملے میں حسرت اور شاد عارفی سب سے آگے ہیں۔ شاد اپنے شاگرد کو سب سے پہلے یہ صلاح دیتے ہیں کہ عشق کے تجربہ سے قبل عشقیہ شاعری نہ کرو۔ یہاں پر یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاد صاحب کی واقعہ نگاری کی شان اوروں سے مختلف ہے وہ ایک واقعہ کو بلا کسی تکلف کے نظم کر دیتے ہیں اور نہایت سادگی سے خود واقعہ کی شعریت شعر میں سمو دیتے ہیں اور اپنی طرف سے اُس واقعہ پر ایک لفظ نہیں بڑھاتے۔ مثلاً "لکھکر میرا نام اے شاد اُس نے بھیجا ہے رومال" — یہ بیت زمانے تک شاد صاحب پر جو جذبات حاوی رہے اُن کا تعلق قدرتی طور پر عشق سے تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک ذہین نوجوان کی طرح اُس کی تمام کیفیات کا مطالعہ کیا ہے اور وہی نظم کر دیتے ہیں۔

محب عارفی بی۔ اے (علیگ)

---

[1] پنہاں؟ — [2] غالباً ضلالِ ہرگ

باب الاستفسار

حالی، نذیر احمد، شبلی، آزاد

(جناب یحییٰ علی جمال - اودے پور)

حالی - نذیر احمد - شبلی اور آزاد میں سب سے بڑا انشاء پرداز کون ہے، اس باب میں نگار کے تمام پچھلے جرائد خاموش ہیں لہذا خداوند نگار سے استدعا ہے کہ متذکرۂ بالا مسئلہ کے متعلق اپنے ناقدانہ فیصلہ سے آگاہ فرمائیں اگر جواب بذریعہ نگار ہو تو زیادہ بہتر ہے۔

جواب آپ کی ادب نوازی کا ثبوت اور میری شکر گزاری کا باعث ہوگا۔

(نگار) یہ کچھ رسمی سی بات ہوگئی ہے کہ جب ان بزرگوں میں سے کسی ایک کا نام لیا جائے تو ساتھ ہی ساتھ باقی تینوں حضرات کا ذکر خیر بھی کیا جائے حالانکہ تقابل کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ان چاروں میں مشترک نہیں پائی جاتی ۔ آزاد کی شہرت زیادہ تر آب حیات سے وابستہ ہے جو انشاپردازی اور فن انتقاد دونوں حیثیتوں سے بہت معمولی چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی انشا میں کافی رنگینی پائی جاتی ہے لیکن یہ کوئی نئی چیز نہ تھی اور غیر فانی تو خیر اسے کہہ ہی نہیں سکتے، رہ گیا اس کا انتقادی پہلو سو اس کے متعلق زیادہ کہنے سننے کی ضرورت نہیں، کیونکہ آب حیات کے اغلاط جنھیں آزاد کی تحریفات بھی کہہ سکتے ہیں، اب سب کے سامنے ہیں ۔ نذیر احمد کا مرتبہ ایک مخصوص صنف ادب کے لحاظ سے یقیناً بلند ہے، لیکن ایک ادیب یا انشاپرداز کو اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہونا چاہئے ۔ نذیر احمد یقیناً دہلوی زبان کے ماہر تھے۔ لیکن چونکہ انھوں نے اپنے افسانوں میں قصداً کرکے اپنی مہارت زبان کو ظاہر کیا ہے، اس لئے ان کی تصانیف کی حیثیت ایک فرہنگ کی سی ہوگئی ہے اور اکثر جگہ ان میں تصنع نظر آتا ہے لیکن باوجود اس کے نذیر احمد اُردو ادیبوں کی صف اول میں جگہ پانے کے قابل ہیں اور انکے افسانے اپنے پلاٹ کے لحاظ سے تو نہیں لیکن اپنی زبان کے لحاظ سے ضرور ایسی چیز ہیں جو آج صرف عبرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، لیکن کل وہ کلاسکل حیثیت اختیار کرکے استفادہ کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ حالی اور شبلی، البتہ دونوں ایسی ہستیاں تھیں، جن کا نام ساتھ ساتھ لیا جانا نادرست نہیں ہوسکتا۔ دونوں ادیب تھے، دونوں نقاد تھے، دونوں شاعر تھے اور دونوں کی تصانیف دور حاضر کے اُردو ادب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں ۔ حالی کا مقدمہ شعر و شاعری، یادگار غالب، حیات جاوید، انتقادی لٹریچر اور سیرت نگاری میں بڑے بلند مرتبہ کی چیزیں ہیں، لیکن شبلی کی ادبی انتقادی تصانیف میں صرف شعر العجم ہی وہ کتاب ہے جس کا نام حالی کی ان تصانیف کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ موازنۂ دبیر و انیس، اتنی بلند چیز نہیں ۔ تاریخی تذکرہ نویسی اور مذہبی سیرت نگاری کے سلسلہ میں البتہ شبلی کی تصانیف بہت زیادہ نظر آتی ہیں اور ان میں سے بعض (مثلاً المامون - الفاروق - سیرۃ النعمان - سیرۃ النبی اور علم الکلام) یقیناً بڑی کامیاب تصانیف ہیں ۔ فارسی زبان کے غزلگو کی حیثیت سے انھوں نے حالی سے زیادہ لکھا ہے، لیکن تغزل کی صحیح کیفیت کے لحاظ سے حالی بہت بلند نظر آتے ہیں ۔ اُردو میں شبلی کی شاعری، نظم نگاری کی حد سے آگے نہیں بڑھی لیکن حالی جیسا بہترین غزلگو تھا، ویسا ہی نظم نگار بھی تھا۔ اگر ہم شبلی کی تمام منظومات کو ایک طرف رکھیں اور مسدس حالی کو ایک طرف تو بھی پلہ حالی ہی کا بھاری رہے گا۔ چہ جائیکہ حالی کے اُردو تغزل کو بھی اس میں شامل کرلیا جائے کہ اس صورت میں تو شبلی کا نام حالی کے مقابلہ میں لیا ہی نہیں جاسکتا ۔ طرز تحریر و انشاء بیشک شبلی کا زیادہ دلچسپ و رنگین تھا، لیکن بعض کا خیال ہے کہ حالی کی تحریر کی سادگی ہی میں وہ حسن تھا جس پر ہزار رنگینیاں قربان ہیں ۔ بہرحال میری رائے میں حالی کا مرتبہ شبلی سے زیادہ بلند ہے اور اگر انکے ساتھ نذیر احمد اور آزاد کا ذکر بھی ضروری ہو تو بہتر تیسرا نمبر نذیر احمد کا ہے اور چوتھا آزاد کا۔

باب المراسلۃ والمناظرہ

(محمودی رسم الخط)

(مرزا زاہد حسین صاحب - جموں)

حضرت مولانائے محترم تسلیم — نگار جیسے معیاری رسالہ کے دو نمبر یعنی مارچ و مئی ۴۱ء کے دو رسالے پڑھنے کا اتفاق ہوا اور جو چیز مجھے ان چند غیر ادبی سطروں کو لکھنے پر مجبور کر رہی ہے وہ اُردو کا جدید رسم الخط ہے۔ یہ مضمون چونکہ میرے مذاق سے متعلق ہے اسلئے میں نے بھی دخل در معقولات کرنے کی جرأت کی ہے۔ کیونکہ میرا تعلق ٹائپ کی طباعت سے ہے اور یہی میرا ذریعہ معاش ہے اور اس میں کم و بیش بارہ چودہ سال کا کامل تجربہ بھی رکھتا ہوں اس لئے جو کچھ عرض کروں گا فنی نقطۂ نگاہ سے ہوگا نہ کہ ادبی نقطہ نگاہ سے!

آپ دونوں حضرات کی تحریروں کو بغور پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ آپ ہر دو حضرات حروف ہجا کو کم کرنا چاہتے ہیں اور طریقہ کار میں دونوں حضرات کے بعد المشرقین ہے۔ لیکن مقصد میں اتحاد و یگانگت پر میں بھی اس معاملہ میں آپ سے اتفاق رکھتا ہوں کہ حروف ہجا جتنے بھی کم کئے جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔ میں نے بھی کافی غور و خوض کے بعد ایک طریقہ معلوم کیا ہے۔ اگر اس پر عمل کیا گیا تو یقین واثق ہے کہ بہت کچھ آسانی پیدا ہو سکتی ہے وہ طریقہ یہ ہے کہ منقوط حرفوں میں سے ہمشکل جتنے حرف ہیں ان کی ایک ایک شکل لے لیں، مثلاً "بے" سے لیکر "نون" تک ہماری زبان میں پانچ حرف ہیں اور جناب محمود صاحب نے چونکہ "نون" کو بھی "بے" کے ہمشکل حرفوں میں شامل کیا ہے اسلئے مع نون کل چھ حرف ہوئے ان میں سے صرف ایک شکل کو باقی رکھا جاوے۔ ایسے ہی "جیم" کی شکل کے چار حرفوں میں سے ایک، "دال" کی تین شکلوں میں سے ایک، "رے" کی چار شکلوں میں سے ایک، "سین" "شین" کی دو شکلوں میں سے ایک۔ اسی طرح "قاف" تک — اسی صورت سے آپ کے پاس اُنیس حرف رہ جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا منقوط حرف اُڑا دئے جائیں گے؟ نہیں بلکہ یہی حروف منقوط بھی ہیں اور غیر منقوط بھی، وہ اس طرح پر کہ آپ کو نقطے بالکل علٰحدہ تیار کرنے پڑیں گے اور وہ نقطے ویسے ہی کمپوز کئے جا سکیں گے جس طور پر دوسرے حروف کمپوز ہوں گے اور اسی طریقے پر "ڑے" "ڈال" "ڈے" میں جو حرف "رے" اوپر لکھا جاتا ہے انھیں کمپوز کر سکتے ہیں۔ میں نے ایک لفظ کا خاکہ تیار کیا ہے ملاحظہ ہو:

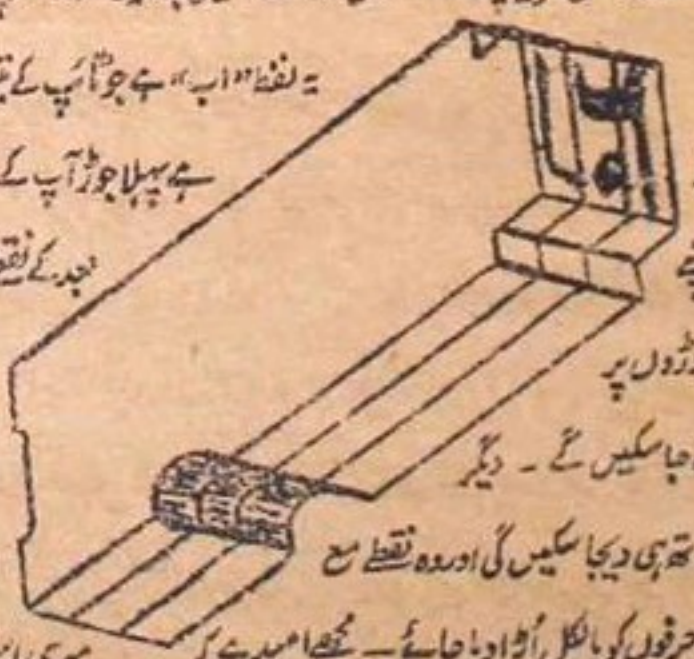

یہ لفظ "اب" ہے جو آپ کے تین جوڑوں سے مرکب کیا گیا ہے حرف "الف" حرف "بے" ہے پہلا جوڑ آپ کے سامنے داہنے طرف سے حرف "بے" کا ہے بے کے اوپر کی نوک اور درمیانی جوڑ نقطے کا جوڑ ذرا باہر کو نکلی ہوئی ہوگی اور وہ اپنے بعد کے نقطے والے جوڑ پر بالکل صحیح بٹھائی جاوے گی اسی طور پر تمام منقوط حرفوں کی نوکیں نقطوں کے جوڑوں پر فٹ کی جاویں گی۔ اسی طرح سے جن حرفوں پر ٹا آتی ہے وہ حرف بھی دو جوڑوں پر کمپوز کئے جا سکیں گے۔ دیگر علامات مخصوصہ جیسے کہ نون غنہ کی ہلالی شکل ویسے ہی دیگر علامتیں بھی نقطوں کے ساتھ ہی دیجا سکیں گی اور وہ نقطے مع اپنی اشکال کے علٰحدہ طیار کر لئے جاویں گے۔ مگر کسی صورت میں بھی مناسب ہوگا کہ ہم آواز حرفوں کو بالکل اُڑا دیا جائے — مجھے امید ہے کہ میری اس تجویز پر غور فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

(نگار) میں بہت شکر گزار ہوں کہ آپنے محمودی رسم الخط پر فنی حیثیت سے غور کر کے بعض بہت مفید مشورے دئے۔ اس مہینے کے نگار میں ایک اور رسم الخط پیش کیا گیا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر اس پر بھی غور کیجئے اور بتائیے کہ فنی حیثیت سے ان دونوں میں کون زیادہ قابل ترجیح ہے۔
مجھے امید ہے کہ دوسرے ماہرین فن بھی اس مسئلہ پر اپنے خیالات سے استفادہ کا موقعہ دیں گے۔

معلومات

روزانہ ۸۰ کرور پتھروں کی بارش

عرفی کا شعر ہے: زمنجنیق فلک سنگ فتنہ می بارد
من ابلہانہ گریزم در آبگینہ حصار

عرفی نے تو "سنگ فتنہ" کی بارش کا ذکر کرکے اپنے نزدیک صرف شاعری سے کام لیا تھا، لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ شاعری نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ آپ نے رات کو بارہا دیکھا ہوگا کہ دفعتاً ایک روشن لکیر آسمان میں نمودار ہوئی اور کچھ دور جاکر ختم ہوگئی اور ہوسکتا ہے کہ آپ نے اس منظر کو دیکھ کر لاحول ولاقوۃ کا بھی ورد کیا ہوگا، کیونکہ بچپن ہی سے مذہب نے آپ کے کان میں یہ بات ڈالدی ہے کہ اس قسم کے مناظر دراصل چنگاریاں ہیں جو فرشتوں کے گرز اور شیطان کے سر کے تصادم سے پیدا ہوتی ہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ علم کی ترقی نے اس سیدھی سادی بات کو بھی اُلجھاؤ میں ڈال دیا اور آسمان کی اس "روشن لکیر" کی بڑی بھیانک تاویلیں شروع کردیں۔

امریکہ کے ایک پروفیسر شاریل ویلی کا بیان ہے کہ آسمان کے یہ مناظر جنھیں "شہاب ثاقب" کہتے ہیں، دراصل پتھروں کے بڑے بڑے پہاڑ ہیں، جن کی بارش ہماری زمین پر روزانہ کم از کم ۸۰ کرور کی تعداد میں ہوتی رہتی ہے، اور ان میں سے اکثر اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ اگر زمین تک پہونچ جائیں تو شہر کے شہر تباہ کردیں۔ لیکن غنیمت ہے کہ وہ زمین تک پہونچتے نہیں اور اس طرح ہم لوگ تباہی سے بچ جاتے ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ جسوقت یہ زمین کی طرف چلتے ہیں تو ان کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ فضا کے تصادم سے وہ مشتعل ہوکر سفید ہوجاتے ہیں اور پھر دھواں بنکر فضا میں غائب ہوجاتے ہیں، لیکن ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کے کچھ ٹکڑے تحلیل نہیں ہوتے اور وہ زمین تک پہونچ جاتے ہیں۔ ان کو اصطلاح میں نیزک (meteor) کہتے ہیں۔ ان کا حجم زیادہ نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی کافی بڑے ہوتے ہیں اور جس جگہ گرتے ہیں بہت نقصان پہونچا دیتے ہیں۔

امریکہ کے صوبہ اریزونا میں ایک بڑا غار پایا جاتا ہے۔ زمانۂ قبل تاریخ میں کسی وقت کوئی نیزک یہاں گرا تھا اور اسی نے یہ غار پیدا کردیا تھا۔ شمالی سائبیریا میں، بہت زمانہ نہیں گزرا، ایک نیزک گرا تو تمام علماء جمع ہوئے اور انھوں نے بڑی تحقیق کے بعد کچھ علمی اُصول نیازک کے متعلق قایم کئے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، ان پتھروں کی بارش زمین پر بہت ہوتی رہتی ہے، لیکن غنیمت یہ ہے کہ بڑے نیازک اول تو بہت کم گرتے ہیں اور اگر کبھی گرتے بھی ہیں تو آبادیوں سے دور میدانوں میں چھوٹے چھوٹے نیازک البتہ اکثر گرتے رہتے ہیں لیکن ان سے کوئی قابل ذکر نقصان نہیں پہونچتا۔

ایک بار انڈیانا کا ایک نوعمر لڑکا شام کے وقت موٹر چلا رہا تھا کہ دفعتاً اس کی نگاہ کے سامنے سخت چمک پیدا ہوئی اور کان میں دھماکے کی آواز آئی یہ گھبرا کر بھاگ گیا صبح کو لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ موٹر کے اگلے حصے میں ایک سوراخ ہے تحقیق سے معلوم ہوا کہ نیزک کے گرتے سے سوراخ ہوا تھا کیونکہ اس کا ایک ٹکڑا وہاں موجود تھا۔ کلکتہ میں بھی ایک بار نیزک نے دو کسانوں کو ہلاک کیا اور ۱۸۲۷ء میں چھاؤنی مئو میں بھی اسی طرح ایک شخص کی جان گئی۔ چند سال اس طرح کی بات ہے کہ جاپان میں بھی ایک حادثہ اسی قسم کا ہوا، باغ کے اندر جو چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا، ایک جاپانی لڑکا کھیل رہا تھا اور اسکی ماں کچھ دور کسی کام میں مصروف تھی۔ اس نے دفعتاً بچہ کی چیخ سنی تو گھبرا گئی وہ دوڑی دوڑی گئی تو دیکھا کہ اس کے جسم پر دو انچ کے قریب لمبا زخم پایا جاتا ہے اور پاس ہی عجیب قسم کے پتھر کا ایک ٹکڑا بندوق کی شکل کا پڑا ہوا ہے، بعد کو علما کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ نیزک کا ٹکڑا ہے۔ اس وقت سب سے بڑا ٹکڑا وہی تھا جو اریزونا میں گرا تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس نے جو غار بنایا ہے اس کا دہانہ کا قطر ¾ میل ہے اور اس کی گہرائی ۶۰۰ فٹ ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ جس نیزک نے اتنا بڑا غار پیدا کیا ہے، اس کا وزن بارہ ملیون ٹن سے کم نہ ہونا چاہئے۔ سائبیریا کے جس نیزک کا ذکر کیا گیا ہے، اس نے بھی دو میل تک زمین کو اُلٹ پلٹ کر رکھدیا تھا اور دس پندرہ میل چاروں طرف کے درخت خشک کر دئے تھے۔ نیازک کے جو نمونے عجائب خانوں میں اس وقت پائے جاتے ہیں، ان میں سے سب سے بڑا نیزک امریکہ کے عجائب خانہ میں ہے۔ اس کا وزن ۳۶ ٹن سے زیادہ ہے۔ اس کے بعد دوسرا نیزک وہ ہے جو ۱۹۰۰ء میں پڑا ہوا ملا۔ یہ دس فٹ لمبا ہے اور وزن ۱۵ ٹن ہے۔

بھیڑ کی پیٹھ سے انسان کی پیٹھ تک

اس زمانہ کی علمی ترقیوں کی بڑی خصوصیت جس کا تعلق تجارتی و صنعتی دنیا سے ہے یہ ہے کہ ایک چیز جلد سے جلد طیار کر لی جائے اور اس میں کلام نہیں کہ سب سے پہلے امریکہ نے اس طرف قدم اُٹھایا۔ ۱۸۹۸ء میں امریکہ نے ایک انعامی مقابلہ کا اعلان کیا، جسکا عنوان تھا: "بھیڑ کی پیٹھ سے انسان کی پیٹھ تک" یعنی جو کارخانہ کم سے کم وقت میں اونی ملبوس طیار کریگا اسے انعام دیا جائے گا۔ لیکن شرط یہ تھی کہ بھیڑ کی پیٹھ سے اون جدا کرنے، اُسکو صاف کرنے، کاتنے، بُننے، کپڑے کو قطع کرنے اور ملبوس طیار کرنے تک جتنے مراحل ہیں وہ سب اس میں شامل ہوں۔ چنانچہ مینسلوینیا کے ایک کارخانہ نے ۲ گھنٹے دس منٹ کے اندر یہ سب کچھ کرکے دکھا دیا۔ اس خبر کا پھیلنا تھا کہ یورپ میں بھی اس قسم کے انعامی مقابلے شروع ہو گئے اور برطانیہ کے ایک کارخانے نے یہ تمام مراحل تین گھنٹے اور ۲۰ منٹ کے اندر طے کرکے دکھا دئے۔ لیکن اس کے دوسرے ہی دن ایک اور کارخانے نے دعویٰ کیا کہ اون کاٹنا، رنگنا، کاتنا، بُننا اور پھر اس کا کپڑا طیار کرکے ملبوس بنا دینا اس سے بھی کم وقت میں ممکن ہے۔ چنانچہ ٹھیک آٹھ بجکے ۴۸ منٹ پر دس بھیڑیں لائی گئیں اور پانچ آدمی جو اون تراشنے کے ماہر تھے حاضر ہو گئے اور انھوں نے ساڑھے سات منٹ میں اون تراش کر رکھدیا۔ جو اُن ترشتا جاتا تھا اُسے لوگ صاف کرتے جاتے تھے اور جو صاف ہوتا جاتا تھا اُسے رنگنے کے کمرہ میں لیجاتے تھے۔ اُون کے دُھلنے کا کام ۸۰ منٹ میں ختم ہوا۔ پھر تانا جانا قایم کرنے میں ۲۶ منٹ لگے اور اسکے بعد ۲۴ منٹ میں ۱۰ انچ عرض کا چھ گز اونی کپڑا طیار ہو گیا لیکن بعد کو اسکی صفائی وغیرہ میں بھی ۴۸½ منٹ صرف ہوئے۔ جب یہ کام ختم ہو گیا تو فوراً موٹر کے ذریعہ سے یہ کپڑا سلائی کے کارخانہ میں بھیجا گیا جہاں ۳۸ کاریگر اسکا انتظار کر رہے تھے۔ جہاں کپڑا پہونچتے ہی اسکی قطع و برید اور سلائی شروع ہو گئی اور ۲۵ ہاتھوں سے گزر کر سوٹ طیار ہو گیا سلائی کے کارخانہ میں کپڑا گیا۔ ۱ بجکے ۲۸ منٹ پر پہونچا اور بارہ بجکے ۱۳ منٹ پر سوائے آستین لگانے اور پیک کرنے کے سارا کام ختم ہو گیا۔ اس کام میں بھی ۴ منٹ صرف ہو گئے اور اس طرح ۱۲ بجکے ۱۷ منٹ پر سوٹ طیار ہو گیا۔ گویا یہ تمام کام تین گھنٹے ۲۰ منٹ اور ۳۰ سکنڈ میں ختم ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد دوسرے کارخانوں کو بھی شوق پیدا ہوا اور یہ رفتار بڑھتی رہی، یہانتک کہ ایک کارخانہ نے یہ تمام کام صرف ۱۳۰ منٹ میں پورے کرکے دکھا دئے

مطبوعات موصولہ

سوگوار شباب پروفیسر مجنوں گورکھپوری کا فسانہ ہے جسے ایوان اشاعت گورکھپور نے نہایت پاکیزہ طباعت کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے اور دو روپیہ میں اسی پتہ سے ملسکتا ہے۔ یہ فسانہ اب سے دس سال پہلے (یادش بخیر) ایوان میں مسلسل شایع ہوچکا ہے، لیکن افسانہائے مجنوں کی تین مجموعوں میں جو اس سے پہلے شایع ہوچکے ہیں، یہ افسانہ شامل نہیں کیا گیا تھا غالباً اس کے کہ یہ زیادہ طویل تھا یا اس لئے کہ "انفرادی توجہ" چاہتا تھا — مجنوں کی شخصیت کا مطالعہ ذہنی و مادی دونوں حیثیتوں سے دلچسپ بھی ہے اور مشکل بھی، دلچسپ اس لئے کہ باوجود انتہائی قنوطیت کے وہ رنگینی سے خالی نہیں اور مشکل اس لئے کہ ایک ذہین آدمی کی فطرت میں جو متضاد باتیں پائی جاتی ہیں، وہ ان میں بھی پائی جاتی ہیں اور اس لئے وہ ایک نفسیاتی معمہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ہرچند اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اگر مجنوں فسانہ نگاری کی طرف مایل نہ ہوتے، تو ادب و انشا کی وہ کسی دوسری صنف کی طرف مایل ہوتے یا نہ ہوتے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر وہ "فسانہ نگاری" نہ کرتے۔ تو ان کے جذبات کا ہیجان شاید اُن کی صحت کے لئے مفید ثابت نہ ہوتا اور ان کی زندگی محض ایک "مدقوق فلسفی" کی طرح بسر ہوتی — انکے افسانوں میں ہمیں ہر جگہ وہی کانٹے نظر آتے ہیں، جو انکے دل میں چبھے ہوئے تھے اور جن کو اگر نہ نکالا جاتا، تو شاید وہ "داغ مجنوں" بننے سے پہلے ہی "داغ ہستی" بن جاتے۔ چنانچہ "سوگوار شباب" بھی اسی قسم کا فسانہ ہے، جس کو دیکھ کر ہم آسکر وائلڈ کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ He has put much of himself into it مجنوں کی فسانہ نگاری ایک ایسا آرٹ ہے، جو نفسیاتی پس منظر سے شروع ہوتا ہے اور وہیں ختم ہوجاتا ہے یعنی وہ ہمکو اسکی مہلت دیتے ہیں کہ ہم اس سے علحدہ ہوکر کچھ سوچ سکیں اور نہ وہ اپنے "کرداروں" کو اس سے ہٹکر ادھر اُدھر بھٹکنے دیتے ہیں اور اسی لئے میں اُن کے فسانوں میں "ہمیں جاسے سن وجائے تو باشد" کا رنگ زیادہ غالب ہوتا ہے --- دوسری خصوصیت ان کی فسانہ نگاری کی، پلاٹ کا تدریجی ارتقار ہے، یعنی اس میں تازہ شراب کی سی تیزی و تلخی نہیں ہے، بلکہ مئے دیرینہ سال کی سی کیفیت ہے جو آہستہ آہستہ لیکن دیرپا رنگ میں دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے، یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ حُسن ملیح ہے جو دفعتاً آنکھوں میں چکاچوند تو پیدا نہیں کرتا، لیکن بعد کو آہستہ آہستہ وہ رگ رگ میں نشتر توڑ جاتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس افسانہ میں یہ کیفیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے --- افسوس ہے کہ اسوقت مجنوں کی فسانہ نگاری پر کسی بسیط گفتگو کا موقعہ نہیں لیکن اگر مختصر سے مختصر الفاظ میں ان کی افسانہ نگاری پر کوئی جامع و مانع رائے مجھ سے طلب کیجائے تو میں بلا تامل کہہ دونگا کہ اگر بیدل کے اس شعر کو متن قرار دیا جائے کہ

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما — چہ قیامتی کہ نمی رسی زکنار ما بہ کنار ما

تو مجنوں کی افسانہ نگاری اس کی بہترین تفسیر ہے اور شاید مجنوں سے بہتر کوئی مفسر اس کا ہو بھی نہ سکتا تھا۔

تازیانے جناب الطاف مشہدی نے ہاک کے پندرہ افسانہ نگاروں کے پندرہ افسانے انتخاب کرکے اس نام سے شایع کئے ہیں۔ پہلا فسانہ پریم چند مرحوم کا ہے اور آخری راجندر سنگھ بیدی کا — جناب الطاف مشہدی نے اپنے دیباچہ میں ظاہر کیا ہے کہ وہ "ادب برائے زندگی" کے قایل ہیں نہ کہ "ادب برائے ادب" کے اور اس لئے یہ مجموعہ "ترقی پسند جماعت" کے لٹریچر کی چیز ہے۔ اس مجموعہ میں آٹھ افسانے مسلمانوں کے ہیں اور سات ہندوؤں کے، لیکن "ادب برائے زندگی" کے مقصد سے کوئی باہر نہیں اور واقعی مطالعہ کے قابل ہیں۔ قیمت عہ اور ملنے کا پتہ: لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور ہے۔

میں شکوے سے باز آیا!!

کل وعدہ خلافی پہ تجھے دیکھ کے نادم
آیا مرے شکووں کی جبینوں پہ پسینا!

وہ تجھ پہ نظر کر کے مری شکر گذاری
وہ حال مرا دیکھ کے آنسو ترا پینا!

وہ ضبط سے باہر مرے جذباتِ محبت
صہبائے کہن پر وہ گراں خلوتِ مینا

ماتھے پہ بھڑکتے ہوئے بیتابی کے شعلے
چہرے پہ برستا ہوا ساون کا مہینا

ہیجان سے گویائی گراں بار۔ گریباں
ظاہر اُدھر احوال - اِدھر دیدۂ بینا

گردن میں خم - آنکھوں میں تری جرم کا اقرار
دہکے ہوئے رخسار - دھڑکتا ہوا سینا

نظروں کو بچانا - کہ مبادا مجھے للچائے
آنکھوں میں کوائف کا جو رہتا ہے خزینا

آنچل میں گرہ دیکے کسا زور سے اُس کو
قالین کے ریشوں سے نکالا کبھی کینا

گھنگھور ترے گیسو - کھلے دونوں رُخوں پر
اوپر ہے گھٹا گویا تلے مکھ مدینا

گیسو پہ لگا تار شکن بام جبیں تک
بنتا ہوا زائر کی نظر کے لئے زینا

وہ دیدۂ میگوں میں اُبھرتا ہوا آنسو
سونے کی انگوٹھی پہ وہ ہیرے کا نگینا

وعدے پہ اگر تو نہیں آیا تو ہوا کیا؟
میں نے کوئی دم نزع کی شدت ہی سہی نا؟

مرنے پہ بھی گر میرے تجھے ہو نہ ندامت
منظور ہے غم کھا کے ابد تک مجھے جینا

رزمی صدیقی

آہنگِ شباب

جوانی کے پرچم اُڑاتے چلیں — زمانے کی گردن دباتے چلیں
چھلکتے ہوئے جام پیتے چلیں — تڑپتے ہوئے شعر گاتے چلیں
بہاروں کو انفاس میں ڈھالکر — خیاباں خیاباں لُٹاتے چلیں
گرجتے ہوئے بادلوں کی طرح — فضاؤں کے سینے ہلاتے چلیں
چمکتی ہوئی بجلیوں کی طرح — ہر اک راستہ جگمگاتے چلیں
اُمڈتی ہوئی ندیوں کی طرح — ہر اک بند و ساحل گراتے چلیں
جنوں کے مقدس اِشارات پر — ہوا میں گریباں اُڑاتے چلیں
پُرانے ستاروں کی تجدید سے — نئی کہکشائیں بناتے چلیں
غموں کے سمندر دلوں میں لئے — یونہی زیرِ لب مسکراتے چلیں

عدمؔ کی جواں شاعری کا چراغ
اندھیرے دلوں میں جلاتے چلیں

عدمؔ

مطالبات

وفاؤں کے بدلے جفا چاہتا ہوں — بتاؤ تمھیں - کیا بُرا چاہتا ہوں
جہاں تک کسی کی نظر بھی نہ پہونچے — میں اُس حد سے آگے بڑھا چاہتا ہوں
نمایاں ہے یہ میری تصویر سے بھی — کہ جیسے ابھی کچھ کہا چاہتا ہوں
خدا کے لئے اپنی نظروں کو روکو — میں بیہوش ہو کر گرا چاہتا ہوں
سُنا ہے بہت طور و موسیٰ کا قصہ — مگر میں تمھیں دیکھنا چاہتا ہوں
ارے ناخدا، چھوڑ مجھ پر سفینہ — میں طوفاں کی ضد دیکھنا چاہتا ہوں
مری یہ جسارت! مری یہ تمنّا -؟ — میں تجھ سے تجھے مانگنا چاہتا ہوں
اجل کا مرادف ہے آغاز جس کا — میں اُس درد کی انتہا چاہتا ہوں

بسانا ہے اے قہر دُنیائے اُلفت
الگ اپنے ارض و سما چاہتا ہوں

قہر اکبرآبادی

قطعات

خود پرستی ہے اگر میرا قصور — "توہی تو" ہونے کو آخر کیا کہوں ؟
میرے دل میں ہے اگر تیرا ہی نور — توہی بتلا میں کسے سجدہ کروں ؟

عکسِ فطرت ہے جمالِ رنگ و بو — اور نمایش - جلوۂ نیرنگِ شوق
حق تو یہ ہے آئینہ کے روبرو — حُسن کو لایا ہے خود بینی کا ذوق

زندگی ہے "درد" کا لبریز جام — جبر کا غم - آرزو کی بے کسی
اصل میں تو "کشمکش" ہے اس کا نام — پیار سے کہتے ہیں اس کو زندگی

گوپی ناتھ امن

دماغی تفریح

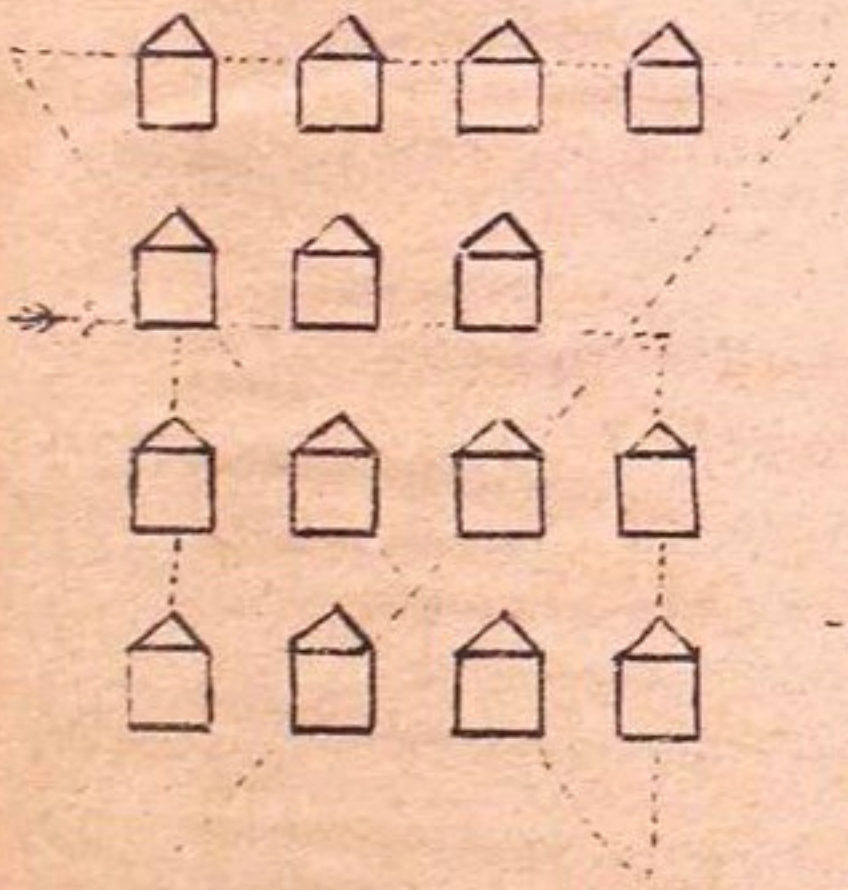

پچھلے مہینے، بارہ تیلیوں والا سوال غلط درج ہوگیا تھا اس مہینے پھر شایع کیا جا رہا ہے۔

باقی دو سوالوں میں ایک سوال کا جواب کسی نے صحیح نہیں بھیجا۔ البتہ زکی اور مشتاق کی عمر ۹ سال اور ۹½ سال سب سے پہلے محمد اسلم صاحب ساکن اُناؤ نے صحیح بتائی اس لئے انعامی کتاب ان کے نام روانہ کر دی گئی۔

غیر حل شدہ سوال کا جواب پہلو میں درج ہے:

جہاں تیر کا نشان ہے سردار کا مکان ہے، یہاں سے وہ چلنا شروع کرتا تھا اور پانچ مرتبہ مڑ کر پھر اپنے مکان پر پہونچ جاتا تھا۔

اس مہینے کے سوالات

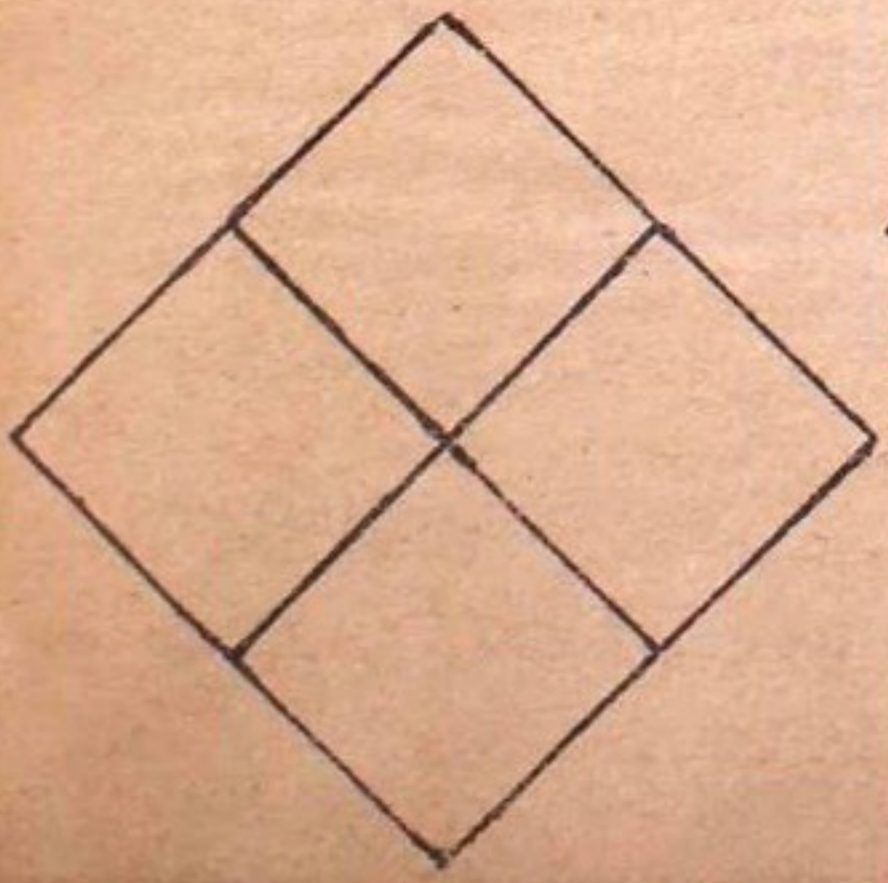

(۱۱) پہلو میں بارہ تیلیوں سے ایک مربع بنایا گیا ہے جو خود چھوٹے چھوٹے چار مربعوں میں تقسیم ہے۔ کیا ان بارہ تیلیوں کو اس طرح رکھا جا سکتا ہے کہ چھ مثلث بالکل برابر کے طیار ہو جائیں۔ تھوڑی سی فکر میں آپ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

(۲) پہلو کے نقشہ میں آپ کو ایک کتا نظر آئے گا جو گیارہ ہڈیاں کہیں سے لے آیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ان کو وہیں دفن کر دے جہاں وہ پڑی ہوئی ہیں، لیکن وہ ڈرتا ہے کہ مبادا اُن مقامات کو بھول جائے جہاں انھیں دفن کیا گیا ہے۔ اس لئے اس نے سوچا کہ زمین پر متعدد خطوط کھینچکر ان میں سے ہر ایک کی جگہ الگ الگ متعین کر دے، چنانچہ اس نے چار سیدھے خط کھینچے اور وہ اس میں کامیاب ہو گیا

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ چار خط اس نے کس طرح کھینچے؟

---

(۳) ایک مدوّر قطعۂ زمین میں چار آدمیوں نے چار مکان بنائے (ملاحظہ ہو پہلو کا نقشہ) لیکن بعد کو ان میں جھگڑا پیدا ہوا اور ہر ایک نے اپنی اپنی زمین کو دیوار سے گھیر لینا چاہا۔ انھوں نے بہت سوچا کہ یہ کیونکر ممکن ہے، مگر نہ سمجھ سکے۔ انھوں نے ایک انجینیر کو بلایا تو اس نے پانچ طرح زمین برابر برابر تقسیم کر دی۔

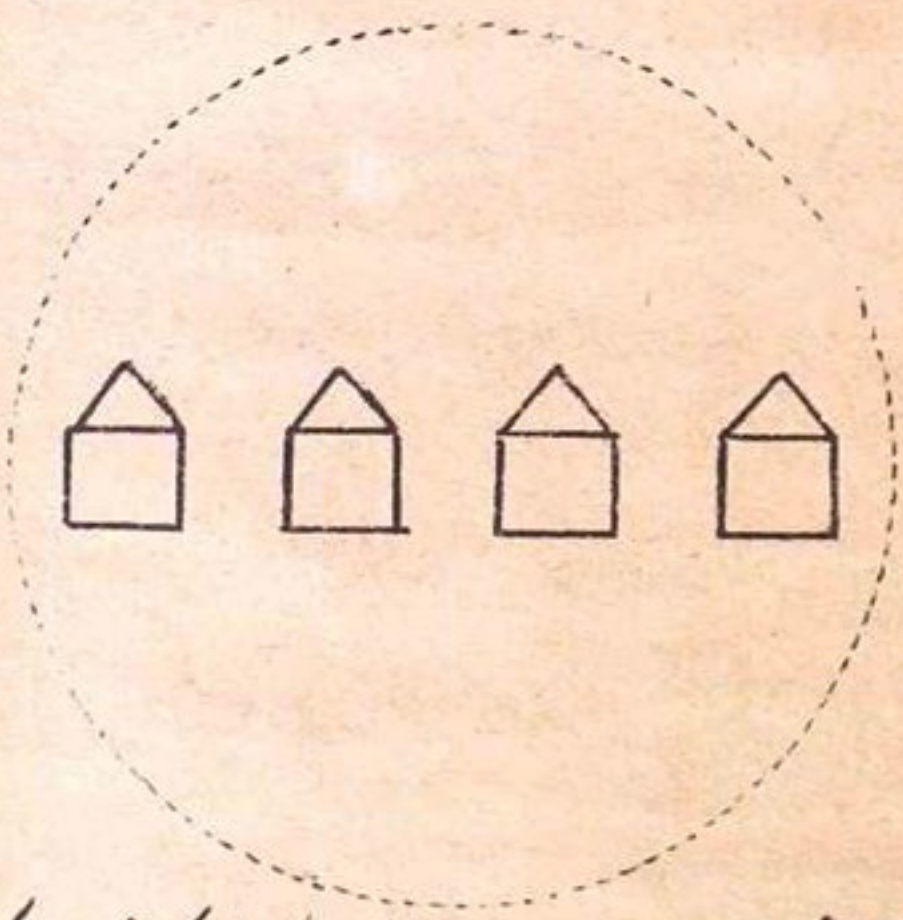

آپ بھی غور کیجئے کہ وہ پانچ صورتیں کیا ہو سکتی ہیں۔

پہلے سوال کے حل کرنے والے کو "شاعر کا انجام"۔ دوسرے سوال کے حل کرنے والے کو "فلسفۂ مذہب"۔ اور تیسرے سوال کے حل کرنے والے کو "فراست السید" دیجائے گی۔ لیکن آئندہ سے یہ انعامات قرعہ کے ذریعہ سے تقسیم کئے جائیں گے، کیونکہ قریب کے مقامات سے حل پہلے پہونچ جاتا ہے دور دور کے مقامات والے اس سے فایدہ نہیں اُٹھا سکتے۔

مُغل لائن لمیٹیڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہاز ران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن پورٹ سوڈان جدّہ و سوئز کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

بمبئی اور کراچی سے عدن جدّہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں نیز پورٹ لوئی مارشیس تک مسافروں اور باربرداری کی سروسیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کیجا سکتی ہیں

تفصیلات کے لئے خط و کتابت کیجئے:

ٹرنر مارریسن اینڈ کمپنی لمیٹیڈ

۱۶- بنک اسٹریٹ بمبئی

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخی ونفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (۳ر) علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار وجواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کے استفسار وجواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی تاریخی وتنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ (۳ر) علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲ر) علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:

۱ — چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲ — مادیئن کا مذہب

۳ — حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ر)

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن وعشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)

علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج وزوال موت وحیات، صحت وبیماری شہرت ونیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (۱ر)

علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات وتنقید عالیہ کا عجیب وغریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲ر)

علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ واساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب وشایستگی اسکی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنفہ کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (۲ر) علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

"نگار" کے خاص نمبر

نگار خانہ یعنی — لکھنؤ نگار یعنی

جنوری سنہ ۳۲ء

(غالب نمبر) غالب شوخ نگار کی حیثیت سے، جس میں ان کی نظم و نثر دونوں کو سامنے رکھکر ان کی شوخ نگاری کو دکھایا گیا ہے۔ صفحات ۱۵۶۔ معہ تصویر غالب (رنگین) قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۵ء

(اُردو شاعری نمبر) اُردو شاعری کی تاریخ اور ہر زمانہ کے شعراء پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام یہ مجموعہ اُردو شاعری پر اتنی معلومات کتابی کا اسکے بعد پھر کسی تذکرہ دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی متعدد مضامین اڈیٹر نگار کے قلم کے ہیں صفحات ۲۳۶۔ اس میں اڈیٹر نگار کی قلمی تصویر بھی شامل ہے۔ قیمت عہ۔ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۶ء

(ہندی شاعری نمبر) ہندی شاعری کی تاریخ اور مستند شعراء کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب کلام، اُردو میں ہندی شاعری پر اس سے زیادہ بہتر انتخاب اور معلومات کا ذخیرہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ صفحات ۱۶۸۔ قیمت عہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۷ء

ڈراما اصحاب کہف خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امامت پر پانچواں مقالہ آزاد خیال شیعہ کے قلم سے۔ یہ خاص نمبر مختلف قسم کی دلچسپیاں رکھتا ہے۔ ڈراما اصحاب کہف اور خطوط آسکر وائلڈ بہترین انشا پردازی کا نمونہ ہیں۔ صفحات ۱۴۴۔ قیمت عہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۸ء

تاریخ اسلامی ہند۔ یہ تاریخ جس دقت نظر اور کاوش تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے اُس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا۔ جغرافی و واقعاتی تحقیق اصل ماخذوں سے کی گئی ہے۔ صفحات ۱۵۲۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ) علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۹ء

(مصحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:۔ حیات مصحفی۔ اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔

صفحات ۱۶۴

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء

(نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:۔ نظیر کا مسلک۔ شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔

صفحات ۱۶۸

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء

یہ نمبر دُنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے، اسی کے ساتھ ایک مقالہ غزلگوئی پر بھی ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔ قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

مطبوعہ نگار پریس پرنٹنگ ورکس لکھنؤ (پرنٹر و پبلشر ایس حسین)